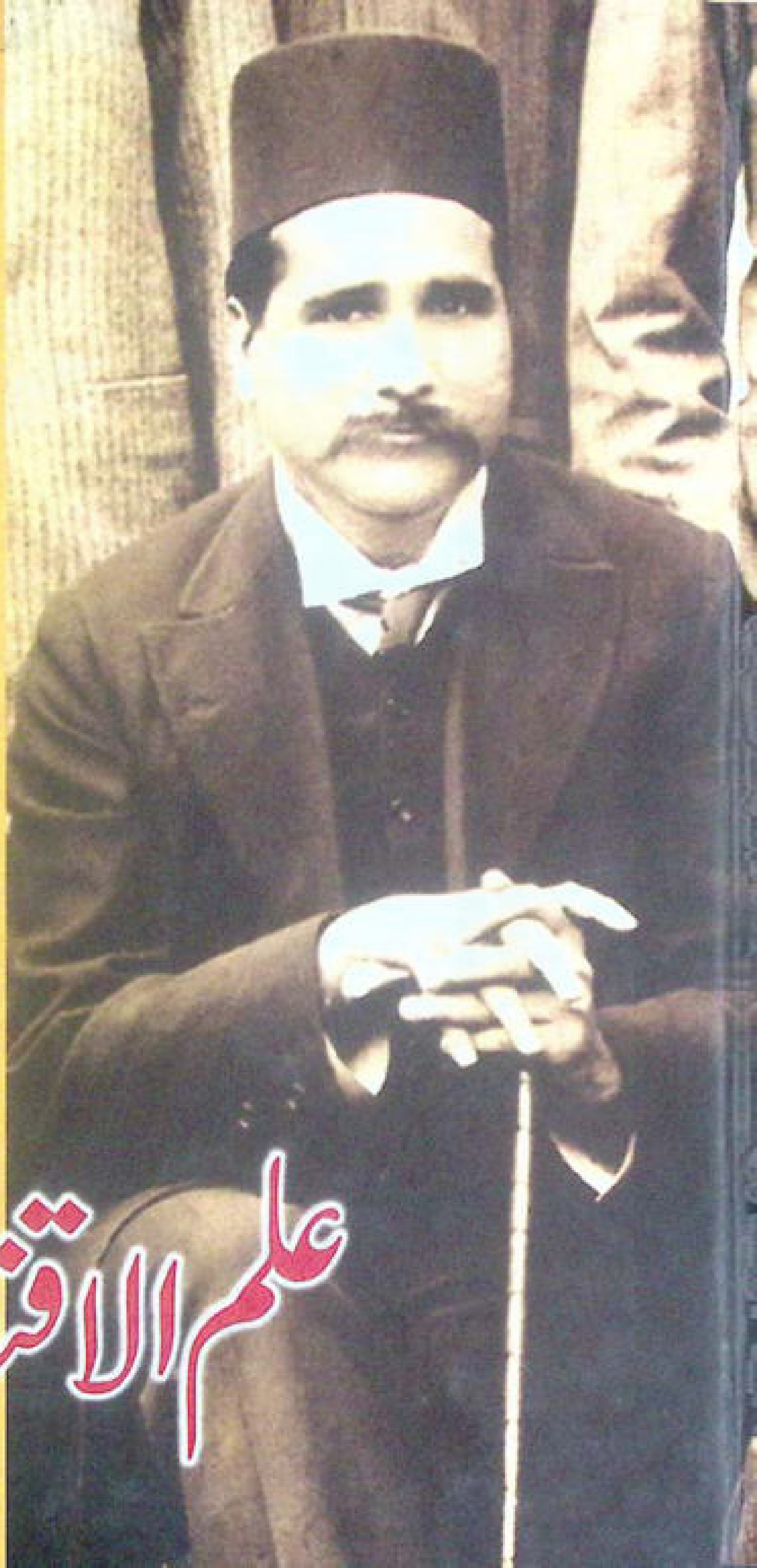
شیخ محمد اقبال

علم الاقتصاد



علم الاقتصاد

(جس کا معروف نام علم سیاست مدن ہے)

شیخ محمد اقبال

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.51 Sh. Muhammad Iqbal
Ilm-ul Iqtisaad/ Shaikh Muhammad Iqbal.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2015.
192pp.
1. Iqbal Studies - Economics.
I. Title.

2015ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-1602-8
ISBN-13: 978-969-35-1602-9

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

فہرست

ڈاکٹر سلیم اختر

تعارف

''علم الاقتصاد (یعنی سیاست مدن)

مصنف شیخ محمد اقبال ایم اے اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج' لاہور۔

یہ قابل ذکر کتاب شیخ صاحب نے جس عرق ریزی سے لکھی ہے اور جس محنت سے انہوں نے علم الاقتصاد کے دقیق اصول کو واضح کیا ہے' اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں' جن کو علمی کتابیں پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہتا ہے۔ توضیح اصول کے ساتھ مصنف نے ہندوستان کے موجودہ تمدنی' اخلاقی اور اقتصادی حالات کی طرف لطیف اشارات کیے ہیں' جن سے پڑھنے والے کی نظر وسیع ہوتی ہے اور اس کو مسائل اقتصاد پر آزادانہ طور پر غور و فکر کرنے کی تحریک ہوتی ہے۔ زر نقد کی ماہیت پر جو کچھ لکھا ہے' ایک خاص منطقیانہ دلچسپی رکھتا ہے' جس سے ایک عقلی مسرت حاصل کرنے کے علاوہ بعض اہم مسائل پر عجب قسم کی روشنی پڑتی ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ اردو لٹریچر میں یہ قابل قدر اضافہ وقعت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ان کے مسائل پر کماحقہ غور کیا جائے گا' کیونکہ ہندوستان کی آیندہ قسمت کا دارومدار زیادہ تر اس ملک کے موجودہ اقتصادی حالات پر منحصر ہے۔

اب وقت اس بات کا متقضی ہے کہ پبلک کم وزنی لٹریچر سے دستبردار ہو کر ان کتابوں کی طرف توجہ کرے' جن کا موضوع انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدنی حالات پر غور کرنا ہے۔ اس کی قیمت صرف ایک روپیہ ہے۔ علاوہ محصول ڈاک۔''

(''مخزن'' اپریل ۱۹۰۷ء)

کسی کتاب کے بارے میں لکھے جانے والے تعارف کا اس کتاب کے اشتہار سے آغاز کوئی نیک فال نہیں کہ تمام تر توصیف کے باوجود اشتہار اشتہار ہی ہوتا ہے لیکن آج سے ستر برس قبل کا یہ اشتہار اشتہار کم اور ایک تنقیدی شذرہ زیادہ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کی شمولیت کی یہ وجہ بھی نہیں اور نہ ہی اشتہار کو تنقیدی اشارات کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ اشتہار اپنی تاریخی اہمیت کی بنا پر شامل مضمون کیا گیا ہے کہ آج علامہ اقبال کے بارے میں ہر

نوع کے دستیاب مواد کی اہمیت مسلّم ہے اور پھر وہ مواد تو اور بھی اہم ثابت ہوگا جو علامہ اقبال کی ایسی کتاب کے بارے میں ہو جس کے بارے میں آج سے چند سال قبل کوئی کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ یہ تو ۱۹۶۱ء میں اقبال اکیڈیمی کراچی نے اسے طبع کیا تو اقبال شناسوں کو اقبال کی ایک نادر تالیف کے مطالعے کا موقع ملا۔ ایسی تالیف جسے اقبال نے اپنی "علمی کوششوں کا پہلا ثمر" قرار دیا۔

ایم اے پاس کرنے کے بعد اقبال ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو اورینٹل کالج میں میکلوڈ عریبک ریڈر بن گئے' جہاں انہوں نے مئی ۱۹۰۳ء تک کام کیا۔ (لیکن اس کے ساتھ وہ گورنمنٹ کالج لاہور اور اسلامیہ کالج لاہور میں بھی جز وقتی ملازمتیں کرتے رہے) اورینٹل کالج کی سالانہ رپورٹ (بابت ۱۹۰۱۔ ۱۹۰۲ء) میں اقبال کے تصنیفی کام کے بارے میں یہ معلومات ملتی ہیں۔

(۱) سٹبس (Stubbs) کی "Early Plantagenents" اردو تلخیص و ترجمہ۔

(۲) واکر (Walker) کی "Political Economy" اردو تلخیص و ترجمہ۔

(۳) علم الاقتصاد پر ایک زیر تحریر کتاب[1]۔

گو ۱۹۰۳ء کی رپورٹ میں اس کتاب کا حوالہ نہیں ملتا لیکن قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی وہ کتاب ہے کیونکہ یہ کتاب ۱۹۰۴ء میں طبع ہوئی۔ گو ان کی شاعری کے مقابلے میں اس کا اتنا چرچا نہ ہوا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اسے خاصی اہمیت دیتے تھے' چنانچہ حیدرآباد میں ہائی کورٹ میں جج بننے کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ نے ۱۵ اپریل ۱۹۲۷ء کو جو مراسلہ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کو لکھا' اس میں اپنی تعلیمی اور تصنیفی کارگزاریوں کے ضمن میں یہ بھی لکھا:

"علم اقتصادیات پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی۔[2]"

"علم الاقتصاد" کے دیباچہ میں اقبال نے اپنے دائرہ کار کی یوں وضاحت کی:

> "یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں بلکہ اس کے مضامین مختلف' مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتقاد تھا۔"

"علم الاقتصاد" کے ضمن میں بنیادی سوال یہ ہے کہ آخر اقبال کو اقتصادیات سے اتنی دلچسپی کیسے پیدا ہوئی کہ انہوں نے ایک باضابطہ کتاب لکھ ڈالی۔ اقبال نے بی اے انگریزی' عربی اور فلسفہ کے ساتھ کیا تھا' جبکہ ایم اے فلسفہ میں! میرے خیال میں اقتصادیات سے دلچسپی اپنے شوق کی نہ تھی بلکہ ملازمت کی بنا پر تھی۔ اورینٹل کالج میں میکلوڈ عریبک ریڈر کی حیثیت سے علامہ کے فرائض میں پنجاب یونیورسٹی کی معرفت چھپنے والی عربی کتابوں کا اہتمام کرنا اور انگریزی اور عربی کی ادبیات اور سائنس یا دیگر علوم و فنون کے موضوعات پر اردو تراجم کرنا شامل تھا۔ اسی لیے اقبال نے تاریخ اور اقتصادیات پر سٹبس اور واکر کی کتابوں کی تلخیص اور تراجم کیے۔ "علم الاقتصاد" میں کئی مقامات پر واکر کے حوالے ملتے ہیں' اس لیے یہ قرین قیاس ہے کہ اقبال نے واکر کی جس کتاب کی تلخیص کی تھی اسی کو پھیلا کر اور

اپنی آراء شامل کر کے ''علم الاقتصاد'' کی صورت دے دی ہو۔ ہر چند کہ دیباچہ میں وا کر کا نام نہیں لیا گیا۔ ایک امر اور بھی قابل غور ہے کہ دوران تدریس اقبال بی اے کے طلبہ کو تاریخ کے علاوہ اقتصادیات بھی پڑھاتے تھے۔ ان دنوں فیوسٹ (Fewcett) کی "Political Economy" داخل نصاب تھی۔ ظاہر ہے کہ اپنے طلبہ کے لیے نوٹس تیار کرنے کے لیے بھی اقبال نے اقتصادیات کے موضوع پر مزید کتب کا مطالعہ کیا ہوگا۔ یوں جو مواد دستیاب ہوا' وہ بالآخر اس کتاب کی صورت اختیار کر گیا۔(3)

اس سے علامہ اقبال کے اس کام کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اقتصادیات سے دلچسپی کے محرکات اور ''علم الاقتصاد'' کی تحریر کے اسباب اجاگر کرنا ہے۔ اقتصادیات سے دلچسپی کے محرکات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن ایک بات ہے کہ تدریسی اور تعلیمی تقاضوں کی عدم موجودگی میں بھی یہ دلچسپی برقرار رہی جس کا اندازہ ممتاز حسن کے اس بیان سے ہو جاتا ہے:

> ''خود اقبال نے مجھ سے بیان کیا کہ کیمبرج کے زمانے میں انہیں وقتاً فوقتاً یہ احساس ہوتا تھا کہ فلسفے میں ان کا انہماک ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے چنانچہ اس احساس کے پیش نظر وہ کیمبرج کی دانش گاہ میں گاہے گاہے اقتصادیات کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے تاکہ اپنی شخصیت میں توازن قائم رکھ سکیں۔''

''توازن'' کا لفظ بہت معنی خیز ہے۔ گویا اقبال اقتصادیات سے وہی کام لیتے رہے' جو بعض لوگ تفریحی ادب یا سنسنی خیز ناولوں سے لیتے ہیں۔ اس بارے میں اب وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بعد میں اقتصادیات سے ان کی دلچسپی کا کیا عالم رہا' ہو سکتا ہے فلسفہ' شعر اور سیاست سے بڑھتی دلچسپی نے اقتصادیات کے مزید مطالعہ کا موقع نہ دیا ہو لیکن اتنا تو طے ہے کہ کتابوں کے برعکس اقبال نے اقتصادیات کو ہم عصر زندگی سے سیکھا اور پھر اپنے افکار میں سمو کر اشعار کی صورت میں یوں پیش کیا کہ پوری قوم کے لیے ایک ضابطہ بن گیا۔

''علم الاقتصاد'' کے مطالعہ کے ضمن میں یہ سوال بنیادی اہمیت کا ہے کہ ۱۹۰۴ء میں طبع ہونے والی اس کتاب کی اہمیت آج کس لحاظ سے ہے؟ کیا محض اس بنا پر کہ یہ علامہ کی اولین کتاب ہے؟ یا اس لیے کہ اسے اردو میں اقتصادیات کے موضوع پر اولین تالیف قرار دیا جاتا ہے؟ اگر صرف یہ دونوں وجوہات ہوں تو اس صورت میں ''علم الاقتصاد'' کی محض تاریخی اہمیت بنتی ہے۔ آج اقبال ہمارے لیے پارس ہیں' اس لیے انہوں نے لوہے کے جس ٹکڑے کو بھی چھوا' وہ ہمارے لیے سونا ہے' لہٰذا علامہ کی کتاب ہونے کے ناتے یہ قابل قدر اور قابل توجہ ہے۔ گو اقتصادیات کے موضوع پر کتاب لکھنا بذات خود ایک علمی اعزاز ہے لیکن یہ اعزاز اس بنا پر دائمی نہیں رہ سکتا کہ گزشتہ صدی میں اقتصادیات کے موضوعات میں جو وسعت اور پیچیدگی پیدا ہوئی اور جس تیز رفتاری سے نظریات و تصورات میں انقلابات آئے' ان کی بنا پر آج سے سو برس قبل کی تالیف محض نفس موضوع اور مواد کی پیش کش پر زندہ نہیں رہ سکتی۔ علمی کتابیں صرف عصری تقاضوں پر اثر اندازی کی صلاحیت سے زندہ رہا کرتی ہیں اور علمی اور عملی زندگی کی ضروریات کی

تشکیل میں ان کی بقا کا راز مضمر ہوتا ہے۔ اسی لیے ہزاروں کتابوں کے مقابلے میں مارکس کی "سرمایہ" زندہ ہے۔ اپنی تمام تر نزاعی حیثیت کے باوجود!

سوال یہ ہے کہ کیا اس کتاب کو اس موضوع پر واقعی اولیت حاصل ہے؟ دراصل "علم الاقتصاد" کی اشاعت ثانی کے موقع پر اس کے مقدمہ نگار نے اس کتاب کو اردو میں اقتصادیات کے موضوع پر اولین تالیف قرار دیا تھا۔ وہاں سے یہ رائے ایسی عام ہوئی کہ اس کتاب پر تمام لکھنے والے اسے اردو میں اقتصادیات پر پہلی تالیف قرار دیتے گئے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ کیونکہ مولوی میر حسن کی مرتبہ کتابیات "مغربی تصانیف کے اردو تراجم" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال سے تقریباً نصف صدی قبل اس موضوع پر کتب کے تراجم کا آغاز ہو چکا تھا' چنانچہ ویلنڈ کی "پولیٹیکل اکانومی" کا ترجمہ بعنوان "معاشیات" ۱۸۴۶ء میں دہلی کالج کی "دہلی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی" کے زیر اہتمام کیا جا چکا تھا (ص:۵۹)۔ "سرسید احمد خاں کی قائم کردہ سائنٹفک سوسائٹی نے دیگر انگریزی علوم کی مانند اقتصادیات کی طرف بھی توجہ دی۔ خاص طور پر معاشی اصطلاحات کے ترجموں میں بڑے سلیقے سے کام لیا گیا تھا۔ اس وجہ سے ان میں سے بعضوں نے یا تو اپنی اصلی حالت میں یا بانداز تغیر اردو میں مستقل جگہ حاصل کر لی۔" (ص:۷۰)۔

"۱۸۶۵ء میں سائنٹفک سوسائٹی" نے "رسالہ علم انتظام مدن" شائع کی۔ یہ کتاب جامعہ آکسفورڈ کے سابق پروفیسر معاشیات مسٹر ناساو ولیم سینئر کی تصنیف "پولیٹیکل اکانومی" کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ رسالہ بھی علی گڑھ میں سرسید کے خانگی مطبع میں چھپا ہے۔ کتاب کے آغاز سے قبل فہرست کے بعد کے صفحوں پر سرسید نے بابو رام کالی اور رائے شنکر داس صاحبین کا شکریہ اس لیے ادا کیا کہ انہوں نے پچاس پچاس صفحہ کا ترجمہ کر دیا۔ اس رسالہ میں اکثر معاشی اصطلاحات کے ترجمے درج کیے گئے ہیں۔" (ص:۷۳'۷۲) "سائنٹفک سوسائٹی" نے ۱۸۶۹ء میں جان اسٹیورٹ مل کی کتاب رڈیمنٹ آف پولیٹیکل اکانومی کے پہلے حصہ کا ترجمہ اصول سیاست مدن کے نام سے شائع کیا۔ مترجم پنڈت دھرم نرائن دہلوی ہے۔ دیباچہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت دھرم نرائن نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ویلنڈ کے مختصر رسالہ کا ترجمہ کیا تھا اور اس کو سوسائٹی علم مفیدہ نے کہ باعانت مدرسہ دہلی کے ترویج علوم میں مصروف تھی' ۱۸۴۵ء میں چھپوایا تھا۔" (ص:۴۷)۔ متذکرہ کتب کے علاوہ ڈاکٹر ویٹلے کی معاشیات پر تقریروں کا ترجمہ لاہور سے ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا تھا (ص:۸۳) جبکہ مل کی پرنسپلز آف پولیٹیکل اکانومی کا ابوالحسن نے ۱۸۹۰ء میں لکھنؤ سے "معلم السیاست" کے نام سے ترجمہ شائع کیا۔ (ص:۹۹) اقتصادیات سے بالواسطہ یا بلاواسطہ تعلق رکھنے والی ان کتابوں کی موجودگی میں "علم الاقتصاد" کے سر اولیت کا سہرا کس طرح باندھا جا سکتا ہے؟

کیا "علم الاقتصاد" اردو میں اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہے؟ آج اگرچہ یہ سوال صرف اکیڈمک نوعیت کا ہے لیکن کتاب کیونکہ علامہ اقبال کی ہے اور علامہ اقبال سے نسبت کی وجہ سے ہر امر قابل توجہ اور وجہ تحقیق قرار پاتا ہے۔ چنانچہ جن اصحاب نے کتاب پر قلم اٹھایا' انہوں نے "اولیت" کا بھی تعین کیا۔ یہ اس لیے ضروری تھا کہ جب اقبال اکیڈمی (کراچی) نے علم الاقتصاد کا دوسرا ایڈیشن (۱۹۶۱ء) شائع کیا تو ممتاز حسن نے "پیش لفظ" میں لکھا:

''علم الاقتصاد'' اردو زبان میں جدید معاشیات پر پہلی کتاب ہے۔''

انہوں نے شاید اسی لیے یہ دعویٰ کیا کہ خود علامہ اقبال نے بھی اس سے ملتا جلتا دعویٰ کیا ہے:

''علم اقتصادیات پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی۔'' (مکتوب بنام: کشن پرشاد شاد ۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء)

اردو غزل سے طبعی رغبت نے ہمیں تعلّی پسند بنا دیا ہے۔ پہلے دعویٰ اپنے بارے میں، پھر دعوے بزرگوں کے بارے میں اور پھر دعوے دوستوں اور ممدوحین کے بارے میں۔ چنانچہ کوئی انشائیہ ایجاد کر رہا ہے تو کوئی ہائیکو میں اولیت کا دعویٰ دار ہے۔

علامہ اقبال کی ''علم الاقتصاد'' بلحاظ موضوع اہم سہی مگر اول نہیں۔ مشفق خواجہ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق اس کتاب سے پہلے اس موضوع پر چھ کتب طبع ہو چکی تھیں:

۱۔ Wayland کی "Flements of Political Economy" کا ۱۸۵۴ء میں پنڈت دھرم نرائن کا ترجمہ مشفق خواجہ کے بموجب:

''معاشیات سے متعلق اردو میں یہ پہلی کتاب ہے۔''

۲۔ ''رسالہ علم انتظام مدن'' مولفین: محمد منصور شاہ خان اور محمد مسعود شاہ خان (۱۸۵۷ء سے قبل اشاعت)

۳۔ Nassan William Senior کی کتاب "Political Economy" کا بابو رام کالی چودھری منصف بلیا ضلع غازی پور اور رائے شنکر داس منصف امروہہ ضلع مراد آباد نے ۱۸۶۵ء میں اردو ترجمہ ''رسالہ علم انتظام مدن'' کے نام سے کیا۔

۴۔ جان اسٹیورٹ مل کی "Political Economy" کے ابتدائی تیرہ ابواب کا ۱۸۶۹ء میں ''اصول سیاست مدن'' کے نام سے اردو ترجمہ رائے بہادر پنڈت دھرم نرائن دہلوی نے کیا۔ یہ دونوں کتابیں سر سید احمد خان کی قائم کردہ ''سائنٹفک سوسائٹی'' (۱۸۶۲ء) کے زیر اہتمام طبع ہوئیں۔

۵۔ جان پارکس لیڈلی کی کتاب کا اردو ترجمہ ''دستور المعاش'' ۱۸۷۳ء میں شائع ہوا۔ مترجم کا نام درج نہیں۔

۶۔ Prof. Jevons کی "Primer of Political Economy" کا اردو ترجمہ شمس العلماء مولوی محمد ذکاء اللہ نے ''کیمیائے دولت'' کے نام سے ۱۹۰۰ء میں کیا۔

(مشفق خواجہ، مقالہ بعنوان ''اقبال کا پہلا علمی کارنامہ: علم الاقتصاد'' مشمولہ ''علم الاقتصاد کا تنقیدی مطالعہ'' مرتبہ: ڈاکٹر صدیق جاوید)۔

ان چھ کتابوں کے ناموں میں "Economy" کے اردو تراجم پر غور کریں تو اس اصطلاح کے تراجم میں تنوع کا احساس ہو جاتا ہے۔ ''انتظام مدن''، ''علم انتظام مدن''، ''مدن'' اور ''دستور المعاش'' ۱۹۹۰ء تک جبکہ ۱۹۰۴ء میں علامہ اقبال ''علم الاقتصاد'' ترجمہ کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ اس زمانہ میں علمی اصطلاحات کے تراجم کے لیے

اصول وضوابط وضع نہ کیے گئے تھے لہٰذا اصطلاحات کے تراجم میں ذوق کے ساتھ ساتھ عربی پر انحصار کیا جاتا تھا۔

۱۹۱۵ء میں جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) اس غرض سے قائم کی گئی کہ سائنس، میڈیکل، انجینئرنگ اور جدید علوم کی تدریس اردو زبان میں ہو گی۔ اس مقصد کے لیے نصابی کتب کے اردو میں تراجم کے لیے ۱۴ اگست ۱۹۱۷ء کو مولوی عبدالحق کی سربراہی میں شعبہ تالیف و ترجمہ قائم کیا گیا۔ دارالترجمہ کو مولانا ظفر علی خان، عبدالماجد دریا آبادی، عبدالحلیم شرر، سید رضا علی، خلیفہ عبدالحکیم، محی الدین قادری زور، وحید الدین سلیم، مرزا محمد ہادی رسوا اور نظم طباطبائی جیسے اہل علم کا تعاون حاصل تھا۔ وحید الدین سلیم نے ''وضع اصطلاحات'' قلم بند کر کے غیر ملکی زبانوں کی اصطلاحات کے تراجم کے لیے رہنما اصول قلم بند کر دیے۔ وضع اصطلاحات کے ضمن میں آج بھی یہ کتاب اساسی حوالہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس تناظر میں ''علم الاقتصاد'' کا مطالعہ کرنے پر علامہ اقبال کی اس علمی کاوش کا یہ پہلو قابل توجہ بلکہ قابل قدر نظر آتا ہے کہ وہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ سے پندرہ برس قبل ذاتی حیثیت میں اصطلاحات کے تراجم کر رہے تھے۔ واضح رہے کہ ۱۹۱۷ء میں تاسیس کے بعد دو برس ابتدائی تیاریوں کے سلسلہ میں صرف ہو گئے۔ ۱۹۱۹ء میں منظم صورت میں تراجم کتب کا آغاز ہوا۔ علامہ اقبال نے ''علم الاقتصاد'' میں ۱۱۶۹ اصطلاحات کے تراجم درج کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ اصطلاحات کے تراجم علمی کتب اور مقالات میں بھی درج ہوں گے۔ جہاں تک وضع اصطلاحات کا تعلق ہے تو علامہ نے خود بھی صراحت کر دی:

> ''علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر بامذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں، جو زمانہ حال کی عربی زبان میں متداول ہیں۔''

علامہ اقبال نے البتہ ان اصطلاحات کی نشاندہی نہ کی جو انہوں نے خود ترجمہ کیں، شاید اس کی ضرورت نہ ہو۔

علامہ اقبال نے دیباچہ میں ''کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح'' دینے پر شبلی نعمانی کا شکریہ ادا کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ علامہ کو اصلاح زبان کی ضرورت نہ ہو گی۔ شاید انہوں نے اصطلاحات کے تراجم کے سلسلہ میں شبلی سے مشورے لیے ہوں۔

آج ''علم الاقتصاد'' علامہ اقبال کی اولین علمی کاوش کے طور پر قابل توجہ ہے۔ اس امر کے باوجود کہ ایک صدی میں اقتصادیات کے مباحث و مسائل میں اتنی وسعت، تنوع اور پیچیدگی پیدا ہو چکی ہے کہ علامہ کی ''علم الاقتصاد'' ابتدائی نوعیت کی تعارفی کتاب نظر آتی ہے۔ درحقیقت یہ ہے بھی ابتدائی نوعیت ہی کی تعارفی کتاب کہ طلبہ کی نصابی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر قلم بند کی گئی تھی۔

''علم الاقتصاد'' پر لکھنے والے بیشتر مقالہ نگاروں نے مقصد تحریر کے بارے میں بھی اظہار خیال کیا ہے۔ علامہ اقبال نے ۱۸۹۹ء میں جب میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے اورنٹیل کالج میں تدریس شروع کی تو اقتصادیات بھی پڑھاتے تھے۔ ''علم الاقتصاد'' بطور نصابی کتاب تحریر نہ ہوئی بلکہ بطور امدادی کتاب..... شاید اسی لیے اسے کسی ناشر

نے شائع نہ کیا۔ علامہ نے خود شائع کی' اس لیے جب کتاب فروخت ہوگئی تو انہوں نے اشاعتِ ثانی کی ضرورت محسوس نہ کی۔ یوں بھی ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان جانے اور واپسی کے بعد ان کے مشاغل تبدیل ہو چکے تھے۔ لہٰذا "علم الاقتصاد" کی تدریس اور کتاب ان کے لیے ضروری نہ رہی ورنہ حسب ضرورت دوسرا ایڈیشن بھی چھپ سکتا تھا' لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے کام کی اہمیت کا احساس رہا۔ چنانچہ کشن پرشاد شاد کے نام "مکتوب (۱۵ اپریل ۱۹۱۷ء) میں یہ دعویٰ کیا:

"علم الاقتصاد" پر اردو میں سب سے پہلے مستند کتاب میں نے لکھی۔"

لیکن جیسا کہ سطور بالا میں لکھا گیا یہ اردو میں پہلی کتاب نہیں' البتہ ساتویں کتاب قرار پاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ علامہ اقتصادیات کے محقق نہ تھے نہ ہی وہ اقتصادیات پر کتابیات مرتب کر رہے تھے' لہٰذا ان سے اس امر کی توقع نہ ہونی چاہیے کہ وہ ماضی کی تمام کتب کے بارے میں معلومات رکھتے ہوں۔

بادی النظر میں تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ اردو میں پہلی کتاب ہی ہوگی' اسی لیے طبع دوم کے دیباچہ نگار ممتاز حسن نے اسے "اردو زبان میں جدید معاشیات پر پہلی کتاب" قرار دیا۔

میری دانست میں...... اور یقیناً اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے "علم الاقتصاد" کی اصل اہمیت محض اقبال سے منسوب ہونے میں مضمر نہیں بلکہ اس لیے کہ آج اس کتاب کے تناظر میں علامہ اقبال کی شاعری میں اقتصادی مسائل سے بحث کو سمجھنے کے لیے نیا زاویہ مل جاتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف کے وقت گو بحیثیت شاعر اقبال کی شہرت پھیل چکی تھی لیکن وہ ابھی تک محض شاعر تھے' حکیم الامت نہ بنے تھے' اس لیے یہ کتاب علامہ اقبال کی فکر سازی کے زمانے سے متعلق ہونے کی بنا پر قابل توجہ بن جاتی ہے۔

کتاب کے دیباچہ میں اقبال نے علم الاقتصاد کی تعریف کرتے ہوئے اسے انسانی زندگی سے بیک وقت وابستہ اور جدا قرار دیتے ہوئے یوں لکھا:

> "علم الاقتصاد" انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کا تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے' جس کا موضوع خود انسان ہے...... اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحہ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ اس سوال کا شافی جواب دینا "علم الاقتصاد" کا کام نہیں کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت

کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے۔ جن کو معلوم کرنے کے لیے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے' مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر ان واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو "علم الاقتصاد" کے دائرہ تحقیق میں داخل ہیں۔ اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریات زندگی میں سے ہے۔"

ان سطروں میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ اقبال انسانی زندگی کو دکھ اور کرب سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری بات جو بے حد اہم ہے یہ ہے کہ وہ غربت کی وجہ دریافت کرنے میں اقتصادیات کے کردار کے بارے میں مشکوک ہیں کیونکہ ان کی دانست میں "اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے۔" بالفاظ دیگر اقبال کی دانست میں زندگی میں تقسیم دولت کا نظام اقتصادی اصولوں کے تابع ہونے کے برعکس ایک نظام اخلاق کے تابع ہے...... لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں۔ یہ اقتصادیات ہی تو ہے' جس نے تقسیم دولت سے نظام زیست میں جنم لینے والی طبقاتی تقسیم کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ وجوہات پر بھی روشنی ڈالی۔ اس لیے اقبال کا اتنی بڑی حقیقت کو محض "انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں" کے تابع کر دینا باعث تعجب ہے۔ اس تعجب میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے جب یہ معلوم ہو کہ اقبال غیر منصفانہ تقسیم دولت کے تصور سے نا آشنا نہ تھے۔ لگان پر بحث کے دوران یوں لکھا:

"جوں جوں آبادی بڑھتی ہے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں' جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں' ان کا لگان بڑھ جاتا ہے۔ زمیندار روز بروز دولت مند ہوتے جاتے ہیں' حالانکہ یہ مزید دولت جو ان کو ملتی ہے نہ ان کی ذاتی کوششوں اور نہ ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی کوششیں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر ان کا کوئی حق نہیں کہ وہ دولت مند ہوتے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی امیری صریحاً اصول انصاف کے خلاف ہے۔"

یہاں اقبال نے واضح الفاظ میں غیر منصفانہ تقسیم دولت کی اساس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اقبال کے وقت تک مارکس اور اینگلز کی تصانیف نہ صرف عام تھیں بلکہ ان کے نظریات کا چرچا بھی تھا' گو اقبال نے کسی موقع پر بھی ان دونوں کے نام نہیں لیے لیکن مندرجہ بالا بیان کو جس طرح ختم کیا گیا اس سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال مارکس کے تصورات سے آگاہ تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''ان نتائج کو ملحوظ رکھ کر بعض محققین نے بڑے زور وشور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ناانصافی جائیداد شخصی سے پیدا ہوتی ہے' جس کا وجود قومی بہبود کے لیے انتہا درجے کا مضرت رساں ہے۔ پس حکماء کے اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہیے۔ بالفاظ دیگریوں کہو کہ لگان کی یہ زائد مقدار جو آبادی کی زیادتی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے سرکار یا قوم کا حق ہے نہ کہ زمینداران کا۔''

یہاں واضح طور سے اقبال مارکس کے ''زائد قدر'' (Surplus Value) کے نظریے کا حوالہ دے رہے ہیں گو انہوں نے اس نظریہ سے وابستہ تمام جزئیات اور امکانات کو اجاگر کرنے کی کوشش نہ کی۔ اقبال نے ایک اور موقع پر بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے:

''سوال یہ ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیاتی کس کا حق ہے؟ زمیندار کا؟ ہرگز نہیں! کیونکہ اس مصالح میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی جس کو زمین سے نکال کر اشیاء تجارتی کی تیاری میں صرف کیا جاتا ہے۔ اس کی مقدار وہی ہے جو پہلے صرف ہوا کرتی تھی بلکہ دستکاروں کی کفایت شعاری کی وجہ سے نسبتاً کم ہوگئی ہے۔ لہٰذا مصالح مذکورہ کی مانگ میں کوئی تغیر نہ آنے کی وجہ سے اونیٰ درجہ کی زمینوں کو کاشت میں نہیں لانا پڑتا' جس سے لگان یعنی زمیندار کے حصے کی مقدار میں اضافہ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ زیادتی ساہوکار کا بھی حق نہیں ہے کیونکہ سرمائے کی مانگ بدستور وہی ہے جو پہلے تھی' کوئی وجہ نہیں کہ شرح سود یعنی ساہوکار کا حصہ نسبتاً بڑھ جائے جبکہ سرمائے کی مانگ میں کوئی اضافہ نہ ہو بلکہ دست کاروں کا کاریگری میں ترقی کرنا ساہوکار کے حصے کو الٹا کم کرتا ہے' کیونکہ کاریگر دستکار کو بالعموم اشیاء تجارت کی تیاری کے لیے اس قدر اوزاروں کی ضرورت نہیں ہوتی جس قدر کہ بھدا کام کرنے والے بے ہنر دستکار کو۔ کاریگر تھوڑے اوزاروں کی مدد سے بھی اپنا کام بخوبی کر سکتا ہے' لہٰذا وہ مجموعی طور سے سرمائے کی مانگ کو کم کرتا ہے یا بالفاظ دیگر شرح سود کم کرتا ہے کیونکہ وہ اس مقدار کو استعمال میں لائے جانے سے بچاتا ہے جو بصورت دیگر اوزاروں کے بنانے میں صرف کرنی پڑتی۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کارخانہ دار کا حق بھی نہیں ہے کیونکہ کارخانہ دار کا حصہ یا منافع صرف اسی صورت میں زیادہ ہوسکتا ہے جبکہ کارخانہ داروں کی مقدار میں زیادتی ہو...... اور یہ کوئی ضرور نہیں کہ دست کاروں کا کاریگری میں ترقی کرنا کارخانہ داروں کی زیادتی مقدار کا مستلزم ہو بلکہ دست کاروں کے ہنر اور کاری گری میں ترقی کرنے سے لیاقت انتظامی کا معیار بڑھ جاتا ہے اور وہ دائرہ تجارت سے روز بروز خارج ہوتے جانے کا میلان رکھتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ

کارخانہ داروں کا منافع کم ہو جاتا ہے' لہٰذا ثابت ہوا کہ پیداوار محنت کی زیادتی جو دستکاروں کی ذاتی ترقی سے پیدا ہوتی ہے خود دست کاروں کا حق ہے۔ زمینداروں' ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔"

یہ طویل اقتباس اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ اس میں محنت اور منافع کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ علامہ اقبالؒ نے کھل کر اس امر پر زور دیا کہ دست کاروں کی محنت کا ثمر ان ہی کے لیے ہونا چاہیے۔ "زمینداروں' ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔" اقبال نے اس ضمن میں جو کچھ لکھا وہ بالکل غیر جذباتی انداز میں علمی معروضیت کے ساتھ لکھا ہے۔ چنانچہ ایک اور جگہ پر اجرت اور منافع کے باہمی تعلق کو اجاگر کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا:

"شرح منافع کے متعلق یہ ضروری اصول قائم ہوا کہ شرح منافع مصارف پیدائش اور اس مدت کے ساتھ جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو نسبت معکوس رکھتی ہے۔

اسی ذرا سی بات کو نہ سمجھنے کے باعث بعض محققین نے بڑی بڑی غلطیاں کھائی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ منافع کی مقدار صرف اسی صورت میں کم ہو سکتی ہے جبکہ اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک کارخانہ داروں اور محنتوں کے سود و زیاں کے درمیان ایک قسم کا ضروری تناقض ہے یا یوں کہو کہ ایک کا نفع اور دوسرے کا نقصان ہے۔ لیکن...... شرح منافع کی تعیین میں مدت کو بھی بڑا دخل ہے یعنی اگر سرمائے اور منافع کے مقادیر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو تو جس مدت میں منافع کی ایک خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اس مدت کے کم ہو جانے یا یوں کہو کہ اشیاء تجارتی کے بہت جلد فروخت ہو جانے سے شرح منافع بڑھ جاتی ہے اور اس مدت کی زیادتی سے شرح منافع کم ہو جاتی ہے۔ خواہ اجرت کی مقدار میں فرق ہو یا نہ ہو......"

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے علامہ اقبال کی سوچ کا رخ عیاں ہے۔ وہ مارکس اور اشتراکیت کا نام نہیں لیتے لیکن یہ طرز استدلال وہی ہے اور ان آراء کے تناظر میں مارکس' لینن اور سرمایہ و محنت کے موضوع پر لکھی گئی نظمیں ایک نئی جہت اختیار کر لیتی ہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں علامہ کو اقتصادیات کے اس پہلو سے چنداں دلچسپی نہ رہی بلکہ عمر کے آخری دور میں تو وہ اس انداز نظر ہی کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس کی شہادت اس خط سے بھی ملتی ہے جو علامہ نے روزنامہ "زمیندار" لاہور میں چھپوایا تھا۔ ہوا یہ کہ ۲۳ جون ۱۹۲۳ء کے اخبار میں ایک صاحب نے علامہ کی نظم "خضر راہ" اور "پیام مشرق" کی بعض منظومات کے مطالعے سے اقبال کو اشتراکی ثابت کیا۔ علامہ اس پر سخت ناراض ہوئے اور اس کی تردید میں یوں لکھا:

"بالشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے

مترادف ہے۔ اس واسطے اس تحریک کی تردید میرا فرض ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن مجید نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریقہ یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بالشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانونِ میراث اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریقہ قابلِ عمل بھی ہے۔ روسی بالشویزم یورپ کی عاقبت نااندیش اور خود غرض سرمایہ داروں کے خلاف زبردست ردِ عمل ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشویزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن حکیم نے ہمیں بتائی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔''

علامہ کے خیالات میں یہ انقلاب کیوں آیا؟ یہ اساسی نوعیت کا سوال ہے اور اس سوال کی اہمیت یوں بڑھ جاتی ہے کہ ''علم الاقتصاد'' کے مندرجہ بالا مباحث اور ''خضرِ راہ''، ''ساقی نامہ''، ''لینن''، ''فرمانِ خدا'' (فرشتوں سے) اور ''سرمایہ و محنت'' جیسی نظموں کے خالق اقبال نے اپنا موقف کیوں تبدیل کیا اور وہ بھی اس حد تک کہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کا مسئلہ بن جائے؟

اس سوال کے تشفی بخش جواب کے لیے ''علم الاقتصاد'' کی طرف رجوع کرنا تو بالکل بے سود ہو گا کیونکہ یہ ابتدائی دور کی تالیف ہے۔ وہ دور کہ اقبال ابھی حکیم الامت نہ بنے تھے۔ منظومات اور اشعار سے بھی بات سمجھ میں نہ آئے گی کیونکہ اقبال نے مختلف عصری اثرات کے تحت مختلف اوقات میں جو نظمیں لکھیں یا اشعار کہے وہ اس بنا پر فکر اقبال کا درست تناظر مہیا نہیں کرتے کہ بعد میں اقبال نے ان کے برعکس اشعار بھی کہے۔ فکر اقبال جامد نہ تھا بلکہ تغیر پذیر رہا ہے' اسی لیے آج ہمیں مختلف نظموں میں مختلف اقبال نظر آتے ہیں اور اسی لیے اقبال پر تضاد بیانی کا اعتراض بھی کیا جاتا رہا ہے۔ اقبال ایک وقت تک روسی انقلاب اور اشتراکیت سے متاثر رہے تھے' لیکن بعد میں جب انہوں نے اسلام کے ذریعہ ایک مکمل ضابطۂ حیات کی تشکیلِ نو کے لیے اپنی شاعری کو وقف کر دیا تو پھر انہیں یہ سب محض ''مساوات شکم'' نظر آنے لگا اور اسی لیے انہوں نے اسے مسترد کر دیا۔ شاید اسی لیے انہوں نے ''علم الاقتصاد'' کی

اشاعت ثانی کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔

اقبال مسلم مفکرین کی اکثریت سے اس بنا پر ممتاز ہیں کہ باقی صرف مسلم مفکر تھے اور کچھ نہ تھے۔ انہوں نے پہلے سے یہ طے کر رکھا تھا کہ بحیثیت ایک مسلمان اسلام کی ہر بات درست ہے اس لیے اول تو انہوں نے دیگر علوم کے مطالعہ کی ضرورت ہی محسوس نہ کی' لیکن اگر ایسا کیا بھی تو اپنے مخصوص ذہنی رویوں کی روشنی میں جبکہ اقبال مغربی علوم اور ان کے فلسفیانہ تصورات وافکار کے تجزیہ و تحلیل کے بعد اسلام تک آتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اقبال کٹر ملا بنے بغیر مسلم مفکر بنے۔

''علم الاقتصاد'' کے مطالعہ میں آج جو بات چونکا دینے والی نظر آتی ہے وہ ہے اقبال کا خاندانی منصوبہ بندی پر یقین اور اس کی افادیت پر اعتقاد! اور یہ ایسی بات ہے جسے کٹر سوشلسٹ اور پکا مسلمان دونوں ہی ناپسند کرتے ہیں' مگر اقبال دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں:

> ''تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے۔ اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی اور چوری' قتل' قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزار سے پیدا ہوتے ہیں' یک قلم معدوم ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ حالات کی رو سے اس کالی بلا کے پنجے سے رہائی پانے کی یہی صورت ہے کہ نوع انسانی کی آبادی کم ہو تاکہ موجودہ سامان معیشت کفایت کر سکے۔''

موجودہ صدی کے آغاز میں مالتھس کے نظریہ آبادی کا بہت چرچا تھا' جس کی رو سے آبادی میں اضافہ سلسلۂ ہندسیہ (Geometric Progression) کے اصول کے مطابق ہوتا ہے یعنی ۲'۴'۸'۱۶'۳۲ کی رفتار سے جب کہ وسائل پیداوار اصول ریاضی کے تابع ہوتے ہیں یعنی ۱'۲'۳'۴ کے حساب سے بڑھتے ہیں۔ اقبال نے بھی آبادی سے وابستہ تمام مسائل کو مالتھس کے تصورات کی روشنی میں سمیٹا اور اپنے ملک پر نتائج کا اطلاق کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا:

> ''......ان سطور سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم بنی آدم کو کلی طور پر شادی وغیرہ کی لذت اٹھانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی کم سے کم تعداد ہو اور بی بی کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے اور اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبود اسی میں ہے کہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرح پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔''

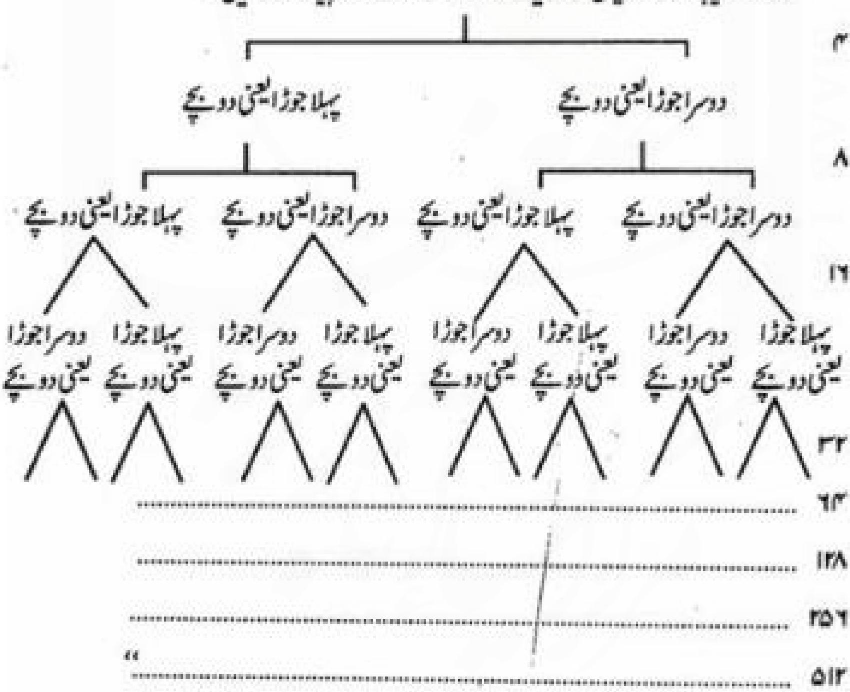
ان دو اقتباسات سے اقبال کا رویہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ کتاب میں انہوں نے اضافہ آبادی کے نقصانات پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ مالتھس کے نظریات متنازع رہے ہیں کیونکہ اس کی رو سے حد سے بڑھی آبادی کا جنگوں' قحط اور آفات کی صورت میں علاج تلاش کیا جاتا ہے۔ اس کے نظریہ کے اس پہلو پر بڑی سخت تنقید کی گئی کیونکہ مالتھس کے بموجب جنگ اور بربادی انسانی زندگی کے لیے لازمی ہی نہیں بلکہ ایک طرح سے تو باعث افادہ

ثابت ہوتی ہے۔ اقبال نے مالتھس پر اس انداز سے تنقید نہیں کی اور نہ ہی اس کے مخالفین کی آراء کے حوالے دیے۔ صرف ایک موقع پر سپنسر کا نام لیا۔

اگرچہ علامہ اقبال نے مالتھس کے آبادی میں اضافہ کے ضمن میں یہ لکھا: "یہ بحث "علم الاقتصاد" کے مبتدی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی" لیکن وہ آبادی میں اضافہ کا اصول سمجھانے کے لیے نقشہ بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حکیم مالتھس اپنے مضمون موسوم بہ "آبادی" میں یہ اصول دریافت کرتا ہے کہ باوجود تجرید اور ضعف مردی کے جو بعض صورتوں میں ہوتا ہے، انسان کی شرح پیدائش بحساب اوسط بالعموم چار بچے فی زن و مرد کے حساب سے ہوتی ہے اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ آئندہ نسلوں کی قوت تولد و تناسل میں کوئی ضعف نہیں عارض ہوگا تو صاف ظاہر ہے کہ نوع انسان کی آبادی کا شجر مندرجہ ذیل طریق پر شاخ در شاخ ہو کر بار آور ہوتا جائے گا۔

۲ مرد عورت کا ایک جوڑا جو حکیم مالتھس کے نزدیک بالعموم چار بچے پیدا کرتا ہے یعنی بحساب اوسط دو لڑکیاں دو لڑکے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ایک جوڑے سے دو جوڑے پیدا ہوتے ہیں۔



علامہ اس نقشہ کی وضاحت میں رقم طراز ہیں:

"اس سلسلے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہندسہ اپنے مقدم سے دگنا ہے۔ پس یہ وہ سلسلہ ہے جو اصطلاح ریاضی میں سلسلۂ ہندسیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا نوع انسان کی آبادی بشرطیکہ کوئی اختیاری یا غیر اختیاری اسباب مانع نہ ہوں سلسلۂ ہندسیہ کے

مطابق برابر بڑھے گی مگر برخلاف اس کے تم پیچھے پڑھ آئے ہو کہ پیداوار زمین یعنی خوراک انسانی قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہے اور اس کی مقدار روز بروز کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ لہٰذا اس واقعہ سے حکیم موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نوعِ انسان کی آبادی اس قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیامِ زندگی کے قدرتی وسائل اس کے لیے کفایت نہیں کر سکتے۔ ذرا خیال تو کرو اگر نوعِ انسان کی آبادی بغیر کسی قید کے بڑھ جائے اور انسان اپنی عقلِ خداداد کی وساطت سے اپنے وسائل زندگی کو زیادہ کرنے کی راہیں نہ سوچے تو بنی آدم کا کیا حشر ہوگا۔ فطرتاً انسان اس قسم کی ہستی ہے کہ اس کے قویٰ نظامِ قدرت کے ان قویٰ کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو اس کے قیامِ زندگی کے مخالف ہوں۔ قدرت عظیم الشان جنگوں، وباؤں اور قحطوں کی وساطت سے خود بخود آبادی انسان و حیوان کو کم کرتی ہے اور انسان اپنی انجام بینی کی وجہ سے اپنے شہوانی قویٰ پر غلبہ پا سکتا ہے یا افزائش آبادی کے میلان کو اختیاری طور پر بھی روک سکتا ہے۔ حکیم مالتھس کے نزدیک افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا اندازے سے زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اکثر ممالک کے مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ نوعِ انسان کی آبادی پچیس سال میں دگنی ہو جانے کا میلان رکھتی ہے۔ جب یہ حال ہو تو جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو وہاں کے لوگوں کو چاہیے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو اختیار کریں جو آبادی کی ترقی کو روک سکتے ہیں۔ انسان کی قوت تولید و تناسل قدرتاً کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے عمل کو اختیاری یا غیر اختیاری اسباب سے روکا نہ جائے تو اس کا وجود مجموعی طور پر بنی آدم کی بربادی اور تباہی کا باعث ہوگا۔"

گزشتہ صدی کے آغاز تک اردو نثر کا سرمایہ محض نصف صدی کے کام پر مشتمل تھا اور وہ بھی نثر کے "عناصرِ خمسہ" کا مرہونِ منت..... لہٰذا ان ہی میں سے اردو کے نثری اسلوب کے "ماڈلز" حاصل ہوتے ہیں۔ سرسید احمد خاں اور مولانا الطاف حسین حالی کی بے رنگ نثر جو صرف مدعا نگاری کے لیے مخصوص تھی؛ شبلی نعمانی کی عالمانہ مگر جذباتی نثر اور محمد حسین آزاد کی استعارہ اور مجاز مرسل پر مبنی تاثراتی نثر!

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو نثر کے اسلوب کے یہ تین ماڈلز تھے۔ علامہ اقبال شاعری میں صاحبِ اسلوب ہیں اور جلال و جمال کے امتزاج سے انہوں نے شاعرانہ اسلوب میں "سبکِ اقبال" کی تخلیق کی لیکن ان کی نثر میں اسلوب کا وہ تجمل نظر نہیں آتا جو ان کی شاعرانہ قوت کی اساس بنتا ہے۔

"علم الاقتصاد" علامہ کی تدریسی ضروریات کے مدنظر تحریر کی گئی تھی؛ اس لیے اس میں اسلوب کی حسن کاری کی جستجو بے سود ہے۔ مزید برآں علامہ نہ تو شبلی تھے اور نہ ہی محمد حسین آزاد..... ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری کا ہنوز ظہور نہ ہوا تھا اور علامہ کے سینئر معاصرین میں شبلی ہی صاحبِ اسلوب تھے؛ جن سے وہ مشورہ بھی لیتے تھے۔

''علم الاقتصاد'' مقالات یا خطوط..... ان سب میں علامہ اقبال نے اسلوب سازی کی سعی نہ کی۔ اپنے ایک خط کے بموجب زبان کو اظہار مطلب کا ایک ذریعہ جاننا اور بس!

''علم الاقتصاد'' سنجیدہ علمی موضوع پر ایسی کتاب ہے جو بنیادی طور پر تدریسی امدادی کتاب کے طور پر تحریر ہوئی اگرچہ علامہ کے اپنے الفاظ کے مطابق:

> ''یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتابوں سے اخذ کیے گئے ہیں..... زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ میں اہلِ زبان نہیں ہوں' جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔''

گویا ''انگریزی علمی کتابوں میں عام متین طرز عبارت'' کے معیار پر ''علم الاقتصاد'' کے اسلوب نگارش کی پرکھ ہونی چاہیے لہٰذا کتاب کے قاری کو علامہ سے شبلی اور آزاد کے اسلوب کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ یوں علامہ (غیر شعوری طور پر ہی سہی) سرسید احمد خان اور مولانا الطاف حسین حالی کی مدعا نگاری کے قریب آ جاتے ہیں یعنی تشبیہ اور استعارے کی پیدا کردہ رنگینی کے مزے دار چسکے کے برعکس سیدھے سبھاؤ میں براہ راست ابلاغ..... علمی نثر' معلومات وکوائف کے ابلاغ کے ساتھ ساتھ موضوعات ومسائل کی تشریح وتوضیح کے لیے استعمال ہوتی ہے اور ابلاغ اس کا وصف خاص ہوتا ہے (یا ہونا چاہیے) اس معیار پر پرکھیں تو ''علم الاقتصاد'' علامہ ہی کے الفاظ کے بموجب ''کم عیار'' نہیں ثابت ہوتی۔

حوالہ جات:-

(1) ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' از ڈاکٹر وحید قریشی' ص:348

(2) ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' از ڈاکٹر وحید قریشی' ص:348' ص 309

(3) کتاب میں ایسے مواقع ملتے ہیں جہاں اقبال نے اس کتاب کے ضمن میں طلبہ کا تذکرہ کیا ہے مثلاً:

1- ''..... تاہم اس خیال سے کہ طلبہ کو علوم کی باہمی استمداد کا طریق معلوم ہو.....''

بعض مقامات پر بحث آگے بڑھانے کے لیے اس لیے احتراز کیا کہ یہ ایک ابتدائی نوعیت کی کتاب ہے مثلاً (1) ''لیکن ہم اس کا مفصل ذکر اس ابتدائی کتاب میں نہیں کرنا چاہتے۔''

2- ''..... یہ ابتدائی کتاب اس کے لیے موزوں نہیں.....''

3- ''..... یہ بحث علم الاقتصاد کے مبتدی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی۔''

..... کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ کالج کے طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اقبال نے ایک امدادی کتاب لکھی؟

(4) ''علم الاقتصاد'' (پیش لفظ) ص:3

اس دلی ارادت کے سبب جو مختصر سے زمانہ تلمذ میں مجھے عالی جناب ڈبلیو۔ بل اسکوئر۔ ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کی خدمت میں پیدا ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی کرسی صدارت پر رونق افروز تھے اور اس عالم گیر شہرت کے باعث جو صاحب ممدوح کو بحیثیت مربی علوم وفنون حاصل ہے، میں اس ناچیز کتاب کو جو میری علمی کوششوں کا پہلا ثمر ہے صاحب موصوف کے نام نامی سے منسوب کرنا چاہتا ہوں اور اس امید پر کہ یہ ہدیہ محقر شرف قبول پائے گا، نہایت ادب سے اسے پیشکش کرتا ہوں۔

مصنف

دیباچہ مصنف

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اس امر کا تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج اس کے اوضاع واطوار اور اس کے طرز زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی بے انتہا موثر ثابت ہوئے ہیں،[1] مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرز عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قویٰ انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے، بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اول یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لیے ایک ضروری جزو ہے، مگر مذہب اور زمانہ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لیے ایک ضروری جزو ہو اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں

---

(1) اصل عبارت میں کتابت یا طباعت کی غلطیوں کی وجہ سے مطلب خلط ملط ہو گیا تھا۔ متن میں یہ الفاظ تھے "اصول مذہب بھی انتہا درجہ کا موثر ثابت ہوا ہے۔" (مرتب)

ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دلخراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟ اس سوال کا شافی جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے جن کو معلوم کرنے کے لیے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر ان واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرہ تحقیق میں داخل ہیں اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریات زندگی میں سے ہے۔ بالخصوص اہل ہندوستان کے لیے تو اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز ان تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنے تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں ان کا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں مہاراجہ بروده نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے۔ پس اگر اہل ہندوستان دفتر اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہوں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں۔ میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کروں اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فرد واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہوگئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغی سوزی اکارت نہیں گئی۔

اس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی

کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر بامذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانہ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں مَیں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً سرمایہ سرمایہ داروں کے معنوں میں یا محنت محنتیوں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو بامذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورہ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب، دستکاری اور محنت، دستکار اور محنتی، نفع اور منافع، ساہوکار اور سرمایہ دار، مالک و کارخانہ دار مرادف استعمال کیے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار کا استعمال ایک باریک فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی پیدائش سے مراد فعل کی ہے، اور پیداوار سے مراد نتیجہ فعل کی۔ علیٰ ہذا القیاس لفظ تبادلہ اس جگہ استعمال کیا ہے جہاں مبادلہ اشیاء زر نقد کے وساطت سے کیا جائے اور لفظ مبادلہ اس موقع پر استعمال کیا ہے جہاں ایک شے دوسری شے کے عوض میں دی جائے۔ عربی زبان میں مبادلے کا یہ مفہوم لفظ مقائفہ سے ظاہر کیا جاتا ہے، مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ہے، اس واسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔

اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جن کے فیضان صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی۔ اے کینٹب بیرسٹر ایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں بھی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورات بھی دیے۔ اس کے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی۔

محمد اقبال

حصہ اول

علم الاقتصاد

اور

اس کا طریق تحقیق

باب اول

علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق

علم الاقتصاد علم انسانی کے اس خاص حصے کا نام ہے جس کا موضوع دولت[1] ہے اور جس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ دولت کی پیدائش تقسیم، تبادلے اور استعمال کے اصول و اسباب وطریق کیا کیا ہیں۔ لہٰذا اس علم کے طالب کا یہ فرض ہے کہ اپنی تحقیق و تدقیق کو دیگر علوم کی تحقیق سے مخلوط نہ کرے۔ کیونکہ کسی علم کی ترقی اس امر پر منحصر ہے کہ اسے دیگر علوم کے سلسلہ سے منفرد سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔ بعض حکما کی یہ رائے ہے کہ علم الاقتصاد وسیع علم تمدن کا ایک جزو ہے اور چونکہ تمدنی زندگی کی عام صورتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس واسطے ان میں سے کسی ایک کا منفرد مطالعہ کرنا کچھ نتیجہ خیز نہ ہوگا۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی کیونکہ انسانی افعال کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ علمی نظر کامل طور سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے، کسی علم کے علم بننے کے لیے اس کی تخصیص[2] ضروری ہے۔

کیا علم الاقتصاد کا مطالعہ دولت کی محبت پیدا کرتا ہے؟ بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ اس علم کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے مفید نہیں ہے کیونکہ اس سے دولت کی محبت پیدا ہوتی ہے جو انسان کو تمام اخلاقی نیکیوں کے ناقابل کر دیتی ہے اور اسے ایک سنگدل دنیادار بنا دیتی ہے۔ اس لغو اعتراض کے جواب میں اول تو ہم[3] یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ انسان کی غرض صرف دولت ہی نہیں ہے تاہم یہ بڑی ضروری اغراض میں سے تو ہے اور اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس کی پیدائش و تقسیم وغیرہ کے اسباب وطریق معلوم کیے جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی[4] کہا جا سکتا ہے کہ سرے سے یہ اعتراض ہی صحیح نہیں ہے۔ علم الاقتصاد کے مطالعہ سے دولت کی محبت نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ اس کا مقصد تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ حصول دولت کی خواہش' جیسا کہ انسانی فطرت میں موجود ہے، انسانی

افعال پر کس طرح اثر کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض میلان طبائع ایسے قوی ہوں کہ حصول دولت کی خواہش کو دبائے رکھیں۔ مگر علم اقتصاد کو ان سے تعلق نہیں ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے چال چلن پر رائے زنی کرے۔ یا یہ فیصلہ کرے کہ کون کون سے محرکات افعال اخلاقی لحاظ سے اچھے ہیں اور کون کون سے برے۔ یہ علم انسانی افعال کے وسیع دائرہ کے صرف اس حصہ پر غور کرتا ہے، جس کا تعلق حصول دولت سے ہے۔ مزید برآں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علم اقتصاد حرص کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ حصول دولت کے صحیح اور مسلم اصولوں پر روشنی ڈالنے سے انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اس قوی خواہش کو ان اصولوں کے تحت میں رکھے اور جنگ و جدل، لوٹ مار وغیرہ سے' جو اس زبردست خواہش کا ضروری نتیجہ ہوا کرتے ہیں[5] احتراز کر کے امن و صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

ہم نے لفظ ''دولت'' کئی جگہ استعمال کیا ہے[6]۔ مگر ابھی تک یہ بیان نہیں کیا کہ اس کی ماہیت اور تعریف کیا ہے۔ دولت میں وہ ممکن الحصول اشیاء شامل ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی ضروریات کو پورا کریں اور جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے مگر ظاہر ہے کہ ہر ممکن الحصول شے جس کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جائے دولت نہیں ہے۔ مثلاً ہر شخص یہ خواہش کرتا ہے کہ اس کے دوست اس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کریں مگر یہ محبت دولت نہیں ہے۔ پس اجزائے دولت کو معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے اشیاء مطلوب کو معلوم کیا جائے۔ مطلوب اشیاء[7] یا وہ تمام اشیاء جن کی ہر انسان جائز اور مناسب طور پر خواہش کر سکتا ہے، دو قسم کی ہوتی ہیں۔

(1) وہ ممکن الحصول اشیاء مادی جن میں تمام مفید اشیاء اور ان کے حقوق استعمال شامل ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، آب و ہوا، زرعی پیداوار، معدنی پیداوار، مصنوعات، تعمیرات، کلیں، اوزار، رہن نامجات، پٹے وغیرہ۔

(2) اشیاء ممکن الحصول غیر مادی یا ذاتی۔ اس ضمن میں دو قسم کی اشیاء شامل ہیں۔

اول تو وہ فوائد جو انسان اوروں سے حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مثلاً حق خدمت ملازمین۔

دوم اس کے ذاتی اوصاف یا قابلیتیں جن کی وجہ سے وہ اپنے کاموں کو سرانجام دیتا[8] ہے۔ مقدم الذکر کو اشیاء غیر مادی خارجی کہتے ہیں اور موخر الذکر کو اشیاء غیر مادی اندرونی۔ اس کے علاوہ اشیاء مطلوب قابل انتقال ہوتی ہیں یا ناقابل انتقال۔ مثلاً انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قوئی یعنی

اشیاء غیر مادی اندرونی۔ روشنی، ہوا یا وہ حقوق جو اس کو بحیثیت ایک خاص ملک کا باشندہ ہونے کے حاصل ہیں۔[9]

اشیاء مطلوب کی تقسیم اور طرح سے بھی ہو سکتی ہے۔ یعنی اشیاء آزاد[10] اور اشیاء قابل تبادلہ[11]۔ اشیاء آزاد سے مراد ان اشیاء کی ہے جو نظام قدرت خود بخود مہیا کرتا ہے اور انسان کو ان کے حاصل کرنے کے واسطے کوشش نہیں کرنی پڑتی۔

اشیاء قابل تبادلہ میں وہ تمام اشیاء قابل انتقال شامل ہیں جن کی مقدار محدود ہو مگر یہ امتیاز عملی لحاظ سے کچھ بڑی وقعت نہیں رکھتا۔

اب اصطلاح ''دولت'' کا مفہوم بالصراحت واضح ہو جائے گا۔ جب ہم کسی شخص کی نسبت لفظ دولت کا اطلاق کرتے ہیں تو اس کے معنوں میں دو قسم کی اشیاء مطلوب شامل سمجھی جاتی ہیں۔

اول وہ ممکن الحصول اشیاء مادی و خارجی جن پر اس کو قانونا یا رواجاً حق ملکیت حاصل ہے اور جو اس وجہ سے قابل انتقال اور قابل تبادلہ ہیں۔

دوم وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی و خارجی جو اس کی ملکیت میں ہوں اور جن کی وساطت سے اشیاء مادی حاصل کی جا سکیں۔ مثلاً کسی شخص کے تجارتی تعلقات وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ''دولت'' کے مندرجہ بالا مفہوم میں انسان کے فطری قویٰ شامل نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ اس کی ذات سے خارج نہیں ہیں بلکہ اس کی ذات میں داخل ہیں یا یوں کہو کہ یہ اشیاء غیر مادی اندرونی ہیں۔ جو محاورہ متعارف کے رو[12] سے دولت میں شامل نہیں۔ پس دولت کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ ان اشیاء مطلوبہ میں داخل ہو جو ممکن الحصول ہوں اور جن کی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جا سکے۔ مگر ظاہر ہے کہ بعض اشیاء ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہیں مگر دولت نہیں کہلا سکتیں۔ مثلاً مذاق صحیح، خاندانی محبت، یا تعلقات وغیرہ۔ لہٰذا دولت کی کامل تعریف کے لیے کسی اور ایسے خاصہ کا معلوم کرنا ضروری ہے جو اس کو دیگر اشیاء سے متمیز کرے۔ یہ خاصہ قابلیت انتقال یا قدر کا زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتا ہے۔ پس دولت سے مراد ان خارجی اشیاء کی ہے جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے اور جو انسان کی ذاتی ملک ہوں اور جن کی قدر تبادلے میں زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو۔ یہ پیمانہ ایک طرف تو اس سعی و کوشش کو ظاہر کرتا ہے جس کی وساطت سے یہ اشیاء پیدا ہوئی ہوں اور دوسری طرف ان انسانی ضروریات کو جن کو یہ پورا کرتی ہیں۔ مختصر طور پر یوں کہہ دو کہ

''دولت'' میں انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے وہ تمام جائز و مناسب اور ممکن الحصول وسائل داخل ہیں جو بالفعل یا بالقوۃ قابل انتقال ہوں۔ اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہی شے دولت کہلا سکتی ہے۔

(۱) جو کوئی خاص شے ہو۔ خواہ مادی خارجی ہو، خواہ غیر مادی خارجی۔

(۲) جس کی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جا سکتی ہو۔ افریقہ کا ایک وحشی اپنے دشمن کے سر کی خواہش کرسکتا ہے۔ مگر یہ خواہش اخلاقی لحاظ سے جائز اور مناسب نہیں ہے۔

(۳) جو ممکن الحصول ہو۔

(۴) جس پر انسان کو حق ملکیت حاصل ہو۔

(۵) جس میں قابلیت انتقال ہو۔ یا یوں کہو کہ جس کی قدر تبادلے میں زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو۔

دولت* کی مندرجہ بالا تعریف میں ہم نے لفظ ''قدر'' (13) کو استعمال کیا ہے جو علم اقتصاد کی ایک ضروری اصطلاح ہے۔ دولت کی تعریف کماحقہ سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس اصطلاح کا مفہوم ذہن نشین ہو۔ فرض کرو کہ میرے پاس ایک گھڑی ہے میں اسے بیچ کر اپنی ضروریات پوری کرنے یا اوروں سے خدمت لینے کی قدرت رکھتا ہوں۔ یہ قدرت مجھے کہاں سے حاصل ہوئی؟ صرف اس گھڑی کی وساطت سے۔ اگر یہ شے میرے پاس نہ ہوتی تو مجھ میں یہ قدرت بھی نہ ہوتی۔ پس ''قدر'' اس قدرت یا قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اس شے کے قابض کو حاصل ہوتی ہے اور جس کو تبادلے میں دے کر وہ شخص بلا لحاظ جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی اوروں کی پیداوار محنت کو حاصل کرسکتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہہ دو کہ قدر قوت تبادلہ کا نام ہے۔ اس تعریف کے الفاظ پر غور کرو۔ ہم نے کہا ہے بلا جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی۔ کوئی مطلق العنان بادشاہ اپنی رعایا کو جہاں چاہے لڑنے مرنے کے لیے بھیج سکتا ہے مگر یہ خدمات علم اقتصاد کے دائرہ میں نہ آئیں گی۔ کیونکہ ان کی بنا پر جبر و اکراہ پر ہے۔ برخلاف ان کے انگریزی سپاہی کی خدمات دائرہ علم اقتصاد میں داخل ہیں کیونکہ وہ اپنی مرضی سے ایک خاص تنخواہ کے عوض فوجی خدمت قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اس ماں کی خدمات بھی دائرہ علم اقتصاد سے خارج ہے جو اپنے بیمار بچے کی حفاظت میں بعض دفعہ جان بھی دے دیتی ہے کیونکہ اس کی بنا ذاتی

تاثرات یا محبت پر ہے۔

اس تعریف کو مختصر طور پر بیان کرتے ہوئے ہم نے کہا ہے کہ "قدر" قوت تبادلہ کا نام ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کے تعین کے لیے تبادلہ ضروری ہے مگر تبادلے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی اور فرد بھی ہو جس کے ساتھ تبادلہ اشیاء کیا جائے۔ اب اس تعریف کے لحاظ سے دیکھو کہ آیا عقل، ہنر اور فطری قویٰ کو جنہیں انسان کے ذاتی اوصاف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے حامل قدر کہا جا سکتا ہے[14]۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اشیاء ناقابل انتقال ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ان کا تبادلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان کی ذات سے منفک نہیں ہو سکتے۔ بعض حکما کا قول ہے کہ چونکہ قدر کے لیے اشیاء میں قابلیت انتقال کا ہونا ضروری ہے اس واسطے ذاتی اوصاف قدر سے معرا ہیں اور دولت میں شامل نہیں ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اگرچہ انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قویٰ میں قابلیت انتقال نہیں ہے تاہم ان کے استعمال میں یہ قابلیت موجود ہے۔ ہم اپنے فطری قویٰ کو کسی اور شخص کی خاطر استعمال کر کے اس سے حق الخدمت حاصل کر سکتے ہیں۔ بڑھئی کا ہنر نہ صرف اوروں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ بالواسطہ اس کی اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے بھی ایسا ہی لازمی ہے جیسا کہ اس کے اوزار وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے محاورہ متعارف کی رو سے اگرچہ لفظ "دولت" کا اطلاق اشیاء خارجی پر کیا ہے۔ تاہم انسان کے فطری قویٰ کو اس کی ذاتی دولت[15] کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس رائے کے لحاظ سے کسی ملک کے لوگوں کا ہنر، دیانت داری وغیرہ بھی اس ملک کی دولت میں شامل ہیں۔ مگر بعض اہل الرائے نے بغیر کسی امتیاز کے ذاتی دولت کو دولت متعارف میں داخل سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک دولت میں تین قسم کی اشیاء داخل ہیں۔

(1) وہ ممکن الحصول اشیاء مادی خارجی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے اور جن پر انسان کو قانونا یا رواجا حق ملکیت حاصل ہو۔

(2) وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی خارجی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے اور جو اس کی ملکیت میں ہوں اور جن کی وساطت سے اشیاء مادی حاصل کی جا سکیں۔ مثلاً حقوق خدمت ملازمین اور تجارتی تعلقات وغیرہ۔

(3) وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی اندرونی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جا سکے۔ مثلاً انسان کے فطری قویٰ۔ ہمارے نزدیک پہلی رائے زیادہ قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔

اگرچہ دونوں میں صرف ایک لفظی فرق ہے۔ معنوی فرق کوئی نہیں۔ قدر کے بیان سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ دولت اور بہبودی مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ اکثر اشیاء ہماری بہبودی کے لیے ضروری ہیں تاہم دولت کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً اگر آزاد دستکاروں کو غلام تصور کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت کی مقدار میں اضافہ ہوگا مگر انسان کی بہبودی کے لیے یہ امر مضرت رساں ہوگا۔ اسی طرح دولت کی مقدار کا مسئلہ ہے۔ بعض دفعہ کچھ عرصہ کے لیے ایسے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں جو ملکی ترقی کے لیے ممد ہوں۔ مثلاً کلوں کی ایجاد سے چھوٹے اوزار استعمال کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ملکی ترقی کا انحصار بہت کچھ اس قسم کی ایجادات پر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ دولت کی مقدار دن بدن کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ اگر آبادی بڑھتی نہ جاتی اور انسانی ضروریات اور حاجات کا دائرہ دن بدن وسیع نہ ہو جاتا تو علم الاقتصاد کے موضوعات کا احاطہ بھی تنگ ہوتا جاتا۔ یہاں تک کہ اس علم کی ضرورت ہی نہ رہتی۔

اس ضمن میں یہ واضح کر دینا بھی لازم معلوم ہوتا ہے کہ "دولت" اور "جائیداد"(16) بھی ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ کیونکہ اس امتیاز کا علم محصول آمدنی(17) کی بحث میں کام آئے گا۔ فرض کرو کہ ایک قطعہ زمین ایک شخص کے لیے تو دولت ہوگی جو اس کا لگان وصول کرتا ہے اور جو اپنے قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے بیچ کر اپنی رقم وصول کر سکتا ہے مگر ملک کے لیے یہ زمین دولت نہ ہوگی کیونکہ اگر فک الرھن ہو جائے تو ملک کی دولت میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ اس امتیاز کو زیادہ وضاحت سے یوں بیان کر سکتے ہیں کہ زمین مذکورہ تو دولت ہے کیونکہ ایک خاص معین قدر رکھتی ہے مگر رہن دولت نہیں بلکہ جائیداد یا دولت کی ایک خاص مقدار کو حاصل کر سکنے یا استعمال میں لا سکنے کا حق ہے جو مرتہن کو حاصل ہے۔ یعنی مالک زمین کی جائیداد کی مقدار اس زمین کی قدر منفی حق مرتہن کے برابر ہے۔ اس مثال میں دولت تو ایک ہی ہے مگر جائیدادیں دو ہیں۔ ایک تو اصل مالک کی جائیداد، دوسری مرتہن کی۔ زمین کی ملکیت خواہ ایک ہو خواہ کئی جائیدادوں پر منقسم ہو، ملک کی دولت میں کوئی تغیر واضح نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ علم الاقتصاد کو لفظ جائیداد سے سروکار نہیں ہے کیونکہ اس لفظ کا مفہوم اقتصادی نہیں، بلکہ قانونی ہے۔

علم الاقتصاد کی ماہیت کو واضح کرنے کے لیے اصطلاحات "دولت" و "قدر" کے معنی کا بالصراحت بیان کرنا ضروری تھا۔ اس واسطے مندرجہ بالا سطور ہم کو لکھنی پڑیں۔ اب ہم پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ علم الاقتصاد کے اصول ابتدائی کیا کیا ہیں۔ اس ضمن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اصول اولیہ اور واقعات کیا ہیں جن کی بنا پر علم الاقتصاد کا ماہر اپنے استدلال کو قائم کرتا ہے؟ کیا اس استدلال میں ان تمام واقعات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے جو دولت پر اثر کرتے ہیں یا صرف چند ضروری واقعات پر قناعت کرنی چاہیے؟ کیا نتائج کلیہ پر پہنچنے کے لیے انسان کی حقیقی فطرت کا مطالعہ لازم ہے یا اس غرض کے لیے ہمیں ایک خیالی انسانی فطرت کا تصور کرنا چاہیے جس کا ہر فعل اوروں کے لیے نمونہ ہو؟ کیا مختلف ممالک کے حالات زمین و آب وہوا اور زرعی قابلیت اور لوگوں کے عادات اور ان کے اوضاع و اطوار کا معلوم کرنا ضروری ہے یا صرف انہیں حالات و اوصاف کا علم ضروری ہے جو بالاشتراک ہر قوم میں پائے جاتے ہیں؟ ان سوالوں کے جواب پر علم اقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق منحصر ہے مگر اس بارے میں حکما کے درمیان بڑا اختلاف رائے ہے۔ بعض کے نزدیک اس علم کے ابتدائی اصول صرف چند واقعات ہیں جن کا تعلق انسانی فطرت، انسانی تمدن اور کرہ ارض کی طبعی بناوٹ کے ساتھ ہے اور بعض کے نزدیک علم الاقتصاد کے ماہر کا یہ فرض منصبی ہے کہ انسانی فطرت کے کسی ایسے واقعہ کو نظر انداز نہ کرے، جس کا تعلق دولت یا دولت کی تقسیم اور پیدائش کے ساتھ ہو۔ لہٰذا ان حکما کی رائے میں جوں جوں انسانی فطرت کا علم وسیع ہوتا جاتا ہے توں توں علم الاقتصاد بھی وسعت حاصل کرتا جاتا ہے۔ ایک محقق جو ان حکما کے طبقہ موخر الذکر میں داخل ہے، کہتا ہے کہ ماہرین علم الاقتصاد کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) ان بڑے بڑے اصولوں کا معلوم کرنا جو حصول دولت پر اثر کرتے ہیں۔

(2) انسان کی دماغی بناوٹ کے بعض ضروری واقعات کا معلوم کرنا جن کا تعلق انسانی فطرت کے ساتھ ہے۔

(3) پیدائش دولت کے قدرتی اسباب کے بڑے بڑے طبعی خواص معلوم کرنا۔

(4) دیگر اسباب کا تحقیق کرنا جو انسانی افعال پر اثر کرتے ہیں جن کا مقصود حصول دولت ہو۔ مثلاً ملکی اور تمدنی رسوم، جدید ضروریات کا پیدا ہونا یا قوانین متعلقہ زمین وغیرہ۔ مگر ہماری رائے میں دونوں فریق راستی پر ہیں۔ علم الاقتصاد کے لیے ضروری ہے کہ اول چند خاص اصول

بطور بنا، کے قائم کیے جائیں اور پھر یہ معلوم کیا جائے کہ انسانی زندگی کے موجودہ حالات و واقعات سے ان ابتدائی اصولوں کے عملاً کیا تغیر پیدا ہوتا ہے۔ بہر حال علاوہ اور باتوں کے ماہرین علم الاقتصاد کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے علم کی بنیاد انسانی فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم کریں، ورنہ ان کو صحیح اور کلی نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ فرضاً اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان بالطبع خود غرض ہے یا اس کی فطرت قدرتاً وصف ایثار سے کلی طور پر معرا ہے اور اس ابتدائی اصول کو اقتصادی استدلال کی بنیاد قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی ہوں گے غلط سمجھے جائیں گے[18] کیونکہ حقیقتاً انسانی فطرت اس قسم کی نہیں ہے بلکہ خود غرضی اور ایثار دونوں سے مرکب ہے۔ اگر کسی قوم میں علم الاقتصاد کے ایسے اصول مروج ہو جائیں جو اس قسم کے غلط مشاہدے پر مبنی ہوں تو وہ قوم ایک دو صدیوں کے عرصہ میں ہی ایک حیرت ناک اخلاقی تنزل کرے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم کے ہر فعل میں بے جا خود غرضی اور زر پرستی کی بو آئے گی جو اس کو کسی نہ کسی دن حضیض ذلت میں گرا کر چھوڑے گی۔ لہٰذا بعض مصنفین نے فطرت انسانی اور دیگر حالات طبعیہ کو ملحوظ رکھ کر علم الاقتصاد کے لیے چند ابتدائی مفروضات یا علوم متعارفہ قائم کیے ہیں جن پر تمام استدلالات اقتصادیہ مبنی ہیں۔ ان میں سے بڑے بڑے اصول مندرجہ ذیل ہیں:-

(1) بالعموم ہر انسان کم و بیش دولت کی خواہش رکھتا ہے۔

(2) سرمایہ دار اور محنتی[19] قدرتاً ان مشاغل کو ترک کر دیتے ہیں جن میں نفع یا اجرت کم ہو اور ایسے مشاغل کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں منافع یا اجرت زیادہ ہو۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ابتدائی اصول اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ملک میں ہر طرح سے امن ہو۔ غلامی کا دستور نہ ہو اور وہ تمام اسباب معدوم ہوں جو سرمایہ داروں اور محنتیوں کو تجارت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ میں منتقل ہونے سے روکتے ہوں۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب سے[20] ایک صدی پہلے ہندوستان میں یہ بات بہت مشکل تھی کہ کوئی شخص ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کر کاروبار کرے۔

(3) زمین کمیت یا مقدار میں محدود ہے، لیکن کیفیت یا خواص میں بالعموم ایک ملک کی زمین

دوسرے ملک کی زمین سے مختلف ہوتی ہے۔

(4) دنیا کی زمین بالعموم اس قدر زرخیز ہے کہ معمولی علم و ہنر کے کاشتکار کا حاصل محنت اس مقدار سے زیادہ ہوتا ہے جو صرف اس کے ذاتی گزارے کے لیے کافی ہو۔

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ علم الاقتصاد منفرد واقعات کے مطالعہ سے قوانین کلیہ بھی قائم کرتا ہے اور اپنے ابتدائی مسلمہ اصولوں سے نتائج بھی پیدا کرتا ہے جن کی صحت یا عدم صحت واقعات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم کی جاتی ہے۔ یا بالفاظ اصطلاحی یوں کہو کہ یہ علم دیگر علوم کی طرح عمل استقرا[21] اور عمل استخراج[22] دونوں کے استعمال سے مستفید ہوتا ہے۔ اس مقام پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمام کلیہ قوانین واقعات پر مبنی ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کا عمل محدود ہوتا ہے مگر علم الاقتصاد کے قوانین کلیہ خصوصیت کے ساتھ محدود ہیں کیونکہ مختلف ممالک و اقوام کے اقتصادی اور تمدنی حالات و واقعات بعض صورتوں میں کم و بیش مختلف ہیں۔ مثلاً اس علم کے بعض قوانین مغرب کے ممالک کی نسبت تو صحیح ہیں مگر ہندوستان کی صورت میں اختلاف حالات کی وجہ سے صحیح نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حکماء علم الاقتصاد کو ریاضی اور دیگر علوم کا ہم پایہ[23] تصور نہیں کرتے اور اس کو اقوام اور ممالک کے ساتھ مختص سمجھتے ہیں۔ ایک مصنف نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کو اس نے ''اقتصاد ہندی'' کے نام سے موسوم کیا ہے مگر ہماری رائے میں یہ غلطی علم کو فن[24] سے متمیز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علم کا کام صرف واقعات کے علل و اسباب معلوم کرنا ہے۔ یہ کسی طریق عمل اور مستحسن یا مذموم ہونے کا حکم نہیں لگاتا۔ برخلاف فن کے کہ اس کا فرض منصبی خاص واقعات کو ملحوظ رکھ کے کسی مقصد کے حصول کے لیے خاص خاص قواعد اور طریق عمل پیش کرنا ہے۔ ہماری رائے میں علم اقتصاد کا یہ کام نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے لیے کوئی خاص طریق عمل پیش کرے یا کسی طریق پر حکم لگائے۔ لہٰذا ہم اس کو دیگر نظری علوم کی طرح ایک علم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنے میں عذر نہیں ہے کہ اس کے کلیہ اصولوں میں جدید واقعات کے لحاظ سے ایسا تغیر آنا ممکن ہے جس سے ان کی وسعت زیادہ ہو جائے اور ان کو نئے نئے واقعات پر حاوی کر دے۔

علم الاقتصاد کا تعلق دیگر علوم سے

علم اقتصاد اپنی تحقیق میں دیگر علوم سے بہت مدد لیتا ہے۔ مثلاً علم الابدان سے اسے یہ معلوم

ہوتا ہے کہ بقائے زندگی کے لیے ایک معین خوراک کی ضرورت ہے یا انسان کے شہوانی قوئی آبادی کو زیادہ کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ان ہر دو مسلمات سے مسئلہ اجرت و آبادی انسان کی بحث پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔علیٰ ہذا القیاس علم کیمیا سے اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی قابلیت پیداوار[25] کی ایک خاص حد ہے جس کو لگان[26] کی بحث میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔مگر یاد رہے کہ اگرچہ اس علم کے محقق کو دیگر علوم کی تحقیقات سے مدد لینی چاہیے تاہم یہ بھی لازم ہے کہ وہ علم اقتصاد کی ذاتی حدود کو مدنظر رکھے اور ان بحثوں میں نہ پڑ جائے جن کا تعلق دولت کی تقسیم و تبادلہ وغیرہ سے نہیں ہے۔

علم الاقتصاد اور علم اخلاق

اگرچہ علم الاقتصاد دیگر علوم میں سے بعض کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتا ہے مگر علم اخلاق کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔اس علم کی طرح علم اخلاق کا موضوع بھی وہی اشیاء ہیں، جو بعض انسانی مقاصد کے حصول سے وابستہ ہیں۔فرق صرف اس قدر ہے کہ علم اخلاق کا موضوع وہ افعال ہیں جو زندگی کے افضل ترین مقصد کے حصول کی شرائط ہیں اور علم الاقتصاد کا موضوع وہ اشیاء ہیں جو انسان کے معمولی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے معمول مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لیے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نگاہ ڈالنی چاہیے۔مثلاً خوراک، لباس، مکان، ہماری زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان مقاصد کی قدر پر منحصر ہے، جن کو یہ پورا کرتے ہیں مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصلی وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں اس لیے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے کسی قدر مطالعہ علم اخلاق کا بھی ضروری ہے۔اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلالحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصور کی گئی۔جس سے بعض تمدنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔

علم الاقتصاد کا تعلق علم تمدن سے

علم تمدن وہ علم ہے جو انسانی زندگی کا افضل ترین مقصد اور اس کے حصول کے طریق معلوم کرتا ہے۔اس علم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ تمام دیگر علوم اس کی تحقیقات سے متاثر ہوتے ہیں۔

کیونکہ بلاواسطہ یا بالواسطہ تمام علوم کا موضوع ذات انسان ہے جو خصوصیت کے ساتھ علم تمدن کا موضوع ہے۔ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے یا یوں کہو کہ ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت ہی کو لے لو اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی تو پھر اس کا کیا فائدہ؟ لہٰذا علم اقتصاد جس کا موضوع دولت ہے' وسیع علم تمدن پر مبنی ہے' جس کا منشاء ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ کرنا ہے۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ اور یہ تمام اشیاء دولت صحت اور فرائض کی انجام دہی وغیرہ اس مقصد کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں چونکہ علم تمدن کا منشاء ہمارے اعلیٰ ترین مقصد کی حقیقت کا معلوم کرنا ہے اور ہماری روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کی حقیقی قدر اس علم کے لحاظ سے فیصلہ پاتی ہے۔ اس واسطے علم اقتصاد اور دیگر انسانی علوم علم تمدن سے ایک نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں بلکہ ایک معنی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس پر مبنی ہیں۔

علم اقتصاد کے مختلف حصص

علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اس علم کے چار بڑے حصص بیان کرتے ہیں، جو تمام اقتصادی مسائل پر حاوی ہیں۔

(1) دولت کی پیدائش[27]۔
(2) دولت کا تبادلہ[28]۔
(3) دولت کی تقسیم[29]۔
(4) دولت کا صرف یا استعمال[30]۔

اس کتاب کے آئندہ حصص میں علی الترتیب ان کا ذکر ہوگا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ علم الاقتصاد کے حصص کی مندرجہ بالا تقسیم ہم نے منطقی وضاحت کی غرض سے کی ہے ورنہ جیسا کہ تمہیں آگے چل کر معلوم ہوگا یہ سب حصص آپس میں ایک گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اشیاء کے صرف یا استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سی اشیاء ملک میں تیار کی جانی چاہئیں۔ اسی طرح پیدائش دولت کی کیفیت اور کمیت اس کی تقسیم سے متاثر ہوتی ہے اور اگر انقسام محنت[31] کا اصول پورے طور پر مروج ہو جائے تو پیدائش دولت سے تبادلہ لازم آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دولت کی تقسیم تبادلے سے متاثر ہوتی ہے۔

حوالہ جات:-

(1) دولت (Wealth) معاشیات کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کی تشریح مصنف نے بعد میں کر دی ہے۔ (مرتب)

(2) تخصیص: Specialisation (مرتب)

(3) اصلی متن میں "ہم" رہ گیا تھا، جس کی وجہ سے جملہ غیر مربوط ہو گیا تھا۔ یہاں "ہم" کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(4) یہاں "بھی" رہ گیا تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(5) متن میں "ہیں" لکھنے سے رہ گیا تھا۔ (مرتب)

(6) اصل متن میں الفاظ کی ترتیب بگڑ گئی تھی، جسے یہاں درست کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(7) یہاں لفظ "اشیاء" محذوف تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے (مرتب)

(8) اس مقام پر اصل متن میں غالباً کاتب کے سہو کی وجہ سے "کرتا" لکھا ہوا تھا اسے "دیتا" سے تبدیل کر دیا گیا ہے جو محاورہ کے مطابق ہے۔ (مرتب)

(9) یہ تمام ناقابل انتقال اشیاء مطلوب کی مثالیں ہیں۔ (مرتب)

(10) اشیاء آزاد: Free Goods (مرتب)

(11) اشیاء قابل تبادلہ: Exchange Goods (مرتب)

(12) اصلی متن میں "روے" لکھا تھا اسے صحیح کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

☆ (حاشیہ از مصنف): فلسفہ تمدن کا فرض منصبی یہ ہے کہ انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد معلوم کرے، لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف وسائل اور قابل عمل طریق معلوم کرنا اس علم کا کام نہیں ہے بلکہ یہ کام علم الاقتصاد، فن تعلیم اور علم تدبیر مملکت کا ہے۔ تحقیقات تمدنی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تمدن کی ترقی کے لیے تین ضروری شرائط ہیں۔

(1) نظام قدرت کے قویٰ مخفیہ کو معلوم کرنا اور ان سے مستفید ہونا۔ مثلاً زمانہ حال میں برقی قوت سے جو نظام قدرت کے قویٰ میں سے ہے، انسان نے بے انتہا فائدہ اٹھایا ہے۔

(2) تمدنی تعلقات کی تکمیل۔ مثلاً میاں بی بی کا رشتہ بعض اقوام کے نزدیک ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ بعض اس کو ایک معمولی معاہدہ سمجھتے ہیں۔ انسانی تمدن کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ تمام تمدنی تعلقات کے صحیح مفہوم معلوم کر کے ان کے مطابق عملدرآمد کیا جائے۔

(3) افراد کے ذاتی قویٰ کی ترقی مثلاً تعلیم و تربیت وغیرہ۔ نمبر 2، 3 کی تحقیقات اور بحث علم تدابیر مملکت اور فن تعلیم کے متعلق ہے۔ مگر چونکہ نمبر 1 کی تحقیق علم الاقتصاد کا فرض ہے اس واسطے اس ضمن میں چند سطور لکھنا ضروری ہیں۔

بعض لوگوں کی رائے میں نظام قدرت کے مخفی قویٰ کے معلوم کرنے سے انسانی زندگی میں ایک قسم کا تصنع اور بناوٹ آ جانے کا اندیشہ ہے جو اس کی فطرت صحیح کے مخالف ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد مقرر کرتی ہے اور پھر اسی کے اعتبار سے اپنے عمل کو متعین کرتی ہے۔ پس اس لحاظ سے ہر کامل انسانی زندگی میں تصنع کا آنا ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اس قسم کے اعتراضوں سے ہمیں یہ فائدہ اٹھانا چاہیے کہ نظام قدرت کے ان مخفی قویٰ کو معلوم کریں جو حقیقتاً ہمارے لیے مفید ہیں۔ مثلاً لفظ ''دولت'' کا اصل مفہوم معلوم کرنا اور ان اسباب کو معلوم کرنا جن کی وساطت سے دولت پیدا ہوتی ہے۔ ''تاریخ علم الاقتصاد'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں کئی تغیر آئے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ موجودہ مفہوم صحیح اور آخری ہو جس میں اب کوئی تغیر آنے کا امکان نہیں ہے۔ ایک زمانہ میں سمجھا جاتا تھا کہ دولت اور زر نقد مرادف الفاظ ہیں۔ اس غلط مفہوم سے ایک ایسا مغالطہ پیدا ہوا جس کو نظام تجارت (نظام تجارت: Mercantilism: مرتب) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مختلف ممالک کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ دیگر ممالک سے اشیاء کا خریدنا گویا اپنے ملک سے زر نقد کا باہر نکالنا ہے۔ اس خیال سے حتی المقدور اپنی اشیاء فروخت کرتے تھے اور دیگر ممالک کی اشیاء پر اس قدر محصول لگا دیتے تھے کہ وہ ملک میں بکنے ہی نہ پائیں۔ اس مغالطہ کو پہلے ایڈم اسمتھ صاحب نے ظاہر کیا اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی کہ یہ ان مادی اشیاء کا مجموعہ ہے جو انسان کے لیے مفید ہیں۔ جب تک یہ خیال قائم رہے گا دولت ایک قسم کی مادی شے تصور کی جائے گی اور ان اشیاء کے برخلاف ایک قسم کا تعصب پیدا ہوتا جائے گا جو انسانی حاجات کو رفع تو کرتی ہیں لیکن بادی النظر میں ہمارے وسائل زندگی کو زیادہ نہیں کرتیں۔ مثلاً بڑے بڑے صناعوں کو کھینچی ہوئی تصویریں۔ آخر یہ تعریف بھی مقبول نہ ہوئی اور محققین علم اقتصاد کو بتدریج یہ محسوس ہوتا گیا کہ مادے کی مختلف اقسام کی قدر انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لحاظ سے مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا انہوں نے مندرجہ بالا تعریف میں اشیاء کی جگہ ''مفیدات'' (مفیدات سے مراد Utilities ہے: مرتب) کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی کہ یہ ان مفیدات کا مجموعہ ہے جو انسانی ضروریات کو پورا کرتی ہیں، لیکن یہ تعریف بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے کیونکہ لفظ ضرورت کا مفہوم مشکوک ہے، ممکن ہے کہ جس شے کو ہم اپنی ضرورت سمجھے ہوئے ہیں، حقیقت میں ہماری ضرورت نہ ہو۔ اگر ہماری ظاہر ضروریات ہمیں بربادی کی طرف لے جائیں تو ان ضروریات کو پورا کرنے کے اسباب ہرگز دولت نہیں قرار دیے جا سکتے۔ لہٰذا دولت کا اصل مفہوم معلوم کرنے سے پیشتر ہمیں اپنی حقیقی اور ظاہری ضروریات کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ یہاں ایک اور مشکل پیش آتی ہے۔ انسان کی حقیقی ضروریات اس کی ظاہری ضرورت سے متمیز نہیں ہو سکتیں۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ انسان کی حقیقی بہبودی کیا ہے۔ اس کے علاوہ تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج اور حالات میں دولت کی مختلف اقسام کی وقعت ہوتی ہے اور ان کی قدر صرف ان ضروریات کے لحاظ سے متعین نہیں ہوتی جن کو وہ پورا کرتی ہیں بلکہ اس بات پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ انسان ان کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا اثر بالعموم ہماری نگاہ میں ایک قسم کا تغیر پیدا کر دیتا ہے اور بسا اوقات ہم ان اشیاء کو دولت نہیں سمجھتے جن کو تعلیم پانے سے پہلے دولت تصور کیا کرتے

تھے۔ غرض عملی طور پر مفید ہونے کے لیے علم الاقتصاد کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام علوم کی تحقیقات سے فائدہ اٹھائے جن کا مدعا انسان کی زندگی کا افضل ترین مقصد اس کی حقیقی بہبودی اور اس کی تہذیب وتمدن کے مختلف مدارج معلوم کرنا ہے۔ موجودہ حالات میں جہاں تک ہمیں ان امور کا علم حاصل ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ضروریات زندگی دو قسم کی ہوتی ہیں۔

اول وہ اشیاء جو قیام زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

دوم وہ اشیاء جو خاص حالات اور تمدنی حیثیات کے لحاظ سے ضروری ہیں۔ مثلاً گاڑی گھوڑا رکھنا بعض حالات میں محض فضول خرچی ہے لیکن بعض حالات میں ضروریات سے ہے۔ اگر ہر مطلوب شے کو جو ان ہر دو اقسام میں نہیں آتی اسباب تعیش و تحمل یا تن آسانی میں داخل سمجھا جائے تو ظاہر ہے کہ اسباب تعیش میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہوں گی۔

(1) وہ تمام اشیاء جو ان اشیاء سے مشابہ تو ہیں جو اوپر کی ہر دو اقسام میں آتی ہیں تاہم معمولی حالات میں نہ ضروریات زندگی میں سے ہیں نہ ان اشیاء میں سے ہیں جو خاص خاص حالات اور تمدنی حیثیت میں ضروری ہیں۔

(2) وہ تمام اشیاء جو بالعموم مطلوب تصور کی جاتی ہیں مگر انسان کی بہبودی کے لیے ضروری نہیں ہیں۔

(3) وہ اشیاء جن سے ایک قسم کی عارضی لذت حاصل ہوتی ہے تاہم انسانی بہبودی پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

(4) وہ اشیاء جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی زندگی کو ایک اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں مثلاً کتابیں اور فن مصوری کے کرشمے۔

پہلی قسم کی قدر کافی طور پر واضح ہے۔ کیونکہ انسان اپنے کاروبار میں فطرتاً کسی قدر آسائش کو بھی چاہتا ہے۔ دوسری اور تیسری قسم کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ خصوصاً جبکہ ان اقسام کی اشیاء کا حاصل کرنا ان اشیاء کے حصول سے متناقض ہو جو اعلیٰ تر وقعت رکھتی ہیں۔ ہاں چوتھی قسم کی اشیاء پر غور کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے بعض مثلاً کتابیں وغیرہ انسانی ترقی کے لیے اس قدر ضروری ہیں کہ بعض انسان ان کے لیے اصل ضروریات زندگی کو ترک کرنا گوارا کریں گے۔ مگر ان اشیاء کو تیسری قسم کی اشیاء سے تمیز کرنا ذرا مشکل ہے۔ بعض اشیاء جن سے عارضی لذت حاصل ہوتی ہے انسانی زندگی کو تازگی اور شگفتگی بخشنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں لیکن اس کے برخلاف یہ بھی سچ ہے کہ بعض پرانی مہذب قوموں کی بربادی عارضی لذات کی جستجو اور ان اشیاء سے بے پروا رہنے کی وجہ سے ہوئی جن سے انسانی زندگی کو حقیقی قوت اور جلا حاصل ہوتی ہے۔ زمانہ حال کی تہذیب اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لذیذ اور مفید میں امتیاز کیا جائے اور اس امتیاز کو ملحوظ خاطر رکھ کر اپنے افعال و اعمال کو مرتب کیا جائے تاکہ ہمیں اپنی زندگی کی اصل غرض یعنی بہبودی بنی نوع انسان کے حصول میں آسانی ہو۔

(13) مصنف نے "قدر" کے لفظ کو قدر در تبادلہ (Value-in-Exchange) کے معنی میں استعمال کیا ہے اور علم معاشیات میں یہی اس کا معروف استعمال ہے۔ نیز آپ نے اسے قوت خرید و مبادلہ (Purchasing power) کے معنی میں بھی استعمال کیا۔ جدید رجحان یہ ہے کہ Purchasing power کے لیے قوت خرید اور Value کے لیے قدر کی اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ ملاحظہ ہو "فرہنگ اصطلاحات علمیہ" جلد دوم۔ انجمن

ترقی اردو ہند دہلی۔ (۱۹۳۰ء) صفحہ ۱۳۷ اور صفحہ ۱۴۷۔ و "فرہنگ اصطلاحات بنکاری" مرتبہ مجلس اصطلاحات بنک دولت پاکستان صفحہ ۱۵۰ اور صفحہ ۱۸۹ (مرتب)

(14) یہاں مفہوم کو واضح کرنے کے لیے الفاظ کی نشست اور جملہ کی ترتیب میں معمولی تبدیلی کرنا پڑی ہے۔ متن میں جملہ اس طرح تھا: "آیا عقل ہنر اور فطری قوئی جن کو انسان کے ذاتی اوصاف کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے قدر رکھتے ہیں؟" (مرتب)

(15) ذاتی دولت Personal Wealth (مرتب)

(16) دولت Wealth اور جائیداد Property کے لیے مستعمل ہیں۔ (مرتب)

(17) مراد Public Revenue سے ہے۔ (مرتب)

(18) یہاں جملہ کی نشست و ترتیب میں معمولی تغیر کرنا پڑا ہے۔ اصل مسودہ میں یہ الفاظ تھے "تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی سمجھے جائیں گے غلط ہوں گے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتابت میں الفاظ الٹ پلٹ گئے تھے۔ اب انہیں درست کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(19) مصنف محترم نے "محنتی" اور "محنتیوں" کے الفاظ Labourer اور Labourers کے لیے استعمال کیے ہیں۔ جدید رجحان یہ ہے کہ Labour کے لیے "محنت" اور Labourer کے لیے "مزدور" اور "اجیر" کی اصطلاحات استعمال کی جائیں۔ ملاحظہ ہو "فرہنگ اصطلاحات بنکاری" بنک دولت پاکستان (مرتب)

(20) یہاں اصل متن میں "اس" تھا جس سے مطلب واضح نہیں ہوتا۔ اس کی جگہ "کہ اب" ہونا چاہیے۔ (مرتب)

(21) عمل استقراء: Inductive Method (مرتب)

(22) عمل استخراج: Deductive Method (مرتب)

(23) یعنی صحت و قطعیت میں یہ علم بھی ریاضی کی مانند ہے (مرتب)

(24) "علم" سے مراد Science ہے اور فن سے Art -- (مرتب)

(25) قابلیت پیداوار: Productivity (مرتب)

(26) لگان: Rent (مرتب)

(27) Production

(28) Exchange

(29) Distribution

(30) Consumption (مرتب)

(31) انقسام محنت Division of Labour کا ترجمہ ہے۔ جدید اہل قلم "تقسیم عمل" یا "تقسیم کار" کی اصطلاحات کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو: جریدہ نمبر 1۔ کراچی یونیورسٹی، کراچی صفحہ ۵۵۔ (مرتب)

حصہ دوئم

پیدائش دولت

- ☆ زمین
- ☆ محنت
- ☆ سرمایہ
- ☆ قابلیت

باب اول

زمین

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان دولت پیدا کرتا ہے تو ہمارا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ انسان کسی شے کا خالق ہے یا اسے عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ دولت پیدا کرنے سے مراد محنت اور سرمائے کی مدد سے اشیاء میں صرف ایک خاص قدر کا پیدا کرنا ہے جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کی گئی ہے۔

(ا) قدر مختص بالمکان [1] یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک مقام سے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے، دوسرے مقامات میں جہاں اس کی ضرورت ہے، منتقل کرنے سے اس شے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کشمیر میں برف کی کوئی قدر نہیں لیکن اگر پنجاب میں منتقل کی جائے تو اس میں قدر پیدا ہو جائے گی۔

(ب) قدر مختص بالزمان [2] یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک خاص میعاد تک محفوظ رکھنے سے اس شے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً سردی میں برف کا ایک ٹکڑا کچھ قدر نہیں رکھتا۔ لیکن اگر موسم گرما کی آمد تک اس کو کہیں دبا کر محفوظ رکھ دیا جائے تو اس میں ایک خاص قدر کا پیدا ہو جانا ممکن ہے۔

(ج) قدر مختص بالہیئۃ [3]۔ یعنی وہ قدر جو کسی شے میں ایک خاص ہیئت پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً لوہے کی تلوار جو کسی مشین کی مدد سے تیار کی جائے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اصل مطلب شروع کرتے ہیں۔ دولت کی پیدائش کے تین بڑے وسائل ہیں۔ یعنی زمین، محنت اور سرمایہ، مگر بعض کی رائے میں تنظیم محنت بھی پیدائش دولت کی بڑی ممد ہے۔ لہٰذا بعض محققین نے اس کو بھی وسائل پیدائش میں شمار کیا ہے۔ اس باب میں ہم صرف زمین کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

زمین انسان کے لیے ایک قدرتی عطیہ ہے۔ جس کے استعمال پر نہ صرف اس کی موجودہ زندگی اور آسائش کا انحصار ہے۔ بلکہ اس کی وسعت نسل انسانی کی زیادہ سے زیادہ آبادی اور اس کی

مدت بقا کو بھی متعین کرتی ہے چونکہ زمین کی مختلف قسموں کی قابلیت پیداوار [4] مختلف ہے۔ اس واسطے مختلف مقامات میں انسانی محنت کا معاوضہ بھی مختلف ہے۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر انسانی ضرورت بلاواسطہ یا بالواسطہ اس قدرتی عطیے کے مناسب استعمال سے پوری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دولت کے اس وسیع سرچشمہ کو زیادہ زرخیز کرنے یا اپنی ضرورت کے مطابق اس کی قابلیتوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے نئے نئے وسائل دریافت کرتا ہے۔ پیداوار زمین کی کمی بیشی اس کی زرخیزی اور دیگر مقامی خصوصیات مثلاً آب و ہوا، پانی کی افراط وغیرہ پر منحصر ہے، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک اہم اور نہایت ضروری قانون کے ساتھ وابستہ ہے جس کا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا طالب علم کے لیے ضروری ہے۔

اس قانون کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں قانون تقلیل حاصل [5] کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر زمین کی قابلیت پیداوار کی ایک خاص حد مقرر ہے یا یوں کہو کہ پیداوار کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو سرمائے اور محنت کے عوض میں کسی خاص زمین سے حاصل ہو سکتی ہے، ایک خاص معین اندازہ رکھتی ہے۔ جب کوئی زمین ہمارے سرمائے اور محنت کے عوض میں زیادہ سے زیادہ پیداوار دے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کاشت نقطہ تقلیل [6] تک پہنچ گئی ہے۔ یعنی اس معین مقدار کے حاصل کر چکنے کے بعد سرمائے اور محنت کے دگنا کر دینے سے یہ ضروری نہیں کہ زمین مذکور کی پیداوار بھی دگنی ہو جائے بلکہ دگنی پیداوار حاصل کرنے کے لیے دگنے سے زیادہ سرمائے اور محنت کی ضرورت ہو گی۔ اگر محنتیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو ہر محنتی کا حصہ پیداوار کم ہو جائے گا اور اس کو کم تر معاوضے پر قناعت کرنی پڑے گی۔ اسی طرح اگر سرمائے میں اضافہ کر دیا جائے تو پیداوار کی زیادتی اس زیادتی سے کم ہو گی جو کاشت کے نقطہ تقلیل تک پہنچنے سے پیشتر اس اضافہ سے حاصل ہوتی۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک قطعہ زمین پر جس کی وسعت سو ایکڑ ہے اور جس کی سالانہ پیداوار دو ہزار من غلہ ہے، دس آدمی مشترک طور پر کام کرتے ہیں اس حساب سے ایک ایکڑ کی پیداوار بیس من ہوئی۔ اور فی کس دو سو من آئے لیکن اگر محنتیوں کی مذکورہ جماعت میں دو آدمی اور شامل ہو جائیں اور فن زراعت کی ترقی سے زمین کی زرخیزی کی کوئی نئی راہ نہ نکل آئے تو کیا اس زمین کی پیداوار مندرجہ بالا حساب سے دو ہزار چار سو من ہو گی یا اس سے کم و بیش؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے پہلے اس امر کا دیکھنا ضروری ہے کہ آیا پہلے دس آدمیوں کی محنت اور سرمائے سے زمین مذکور کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ گئی تھی۔ اگر کاشت

اس نقطہ تک نہیں پہنچی تو آئندہ سال کی پیداوار دو ہزار چار سو من سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے کیونکہ انقسام محنت کی وجہ سے جس کے فوائد کا ذکر باب چہارم میں آئے گا دس آدمیوں کی نسبت بارہ آدمی زیادہ غلہ پیدا کر سکتے ہیں، لیکن اگر کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ چکی ہے تو دو آدمیوں کی زیادتی سے پیداوار دو ہزار چار سو من سے کم ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بارہ آدمیوں میں ہر آدمی کو دو سو من سے کم پر قناعت کرنی پڑے گی۔ (اس طرح سرمائے اور محنت کی زیادتی سے پیداوار ہر سال زیادہ ہوتی جائے گی اور حصہ فی کس کم ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ زمین کی کاشت کے نقطہ تقلیل تک پہنچ جانے سے پیداوار پھر کم ہونی شروع ہو جائے گی اور حصہ فی کس پہلے سے بھی کم ہوتا جائے گا۔ یہ کمی اول اول تو بتدریج ہو گی۔ مگر بعد میں اس کی سرعت میں یہاں تک ترقی ہو گی کہ زمین مذکورہ کا قطعہ موجودہ محنتیوں کے گزارے کے لیے بالکل ناکافی ہوگا۔ غالباً اس قانون کے عمل نے آریہ ہندوؤں سے وسط ایشیا کے میدان چھڑوائے اور حضرت لوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جدا کیا جیسا کہ توریت میں مذکورہ ہے۔) اگر زمین کی کاشت میں سرمائے اور محنت کے بڑھتے جانے سے بالآخر نقطہ تقلیل تک پہنچ جانیکا میلان نہ ہوتا تو ہر مزارع تھوڑے سے قطعہ زمین کی کاشت پر قناعت کرتا اور اس پر اپنا سرمایہ اور محنت صرف کر کے بہت سی پیداوار حاصل کر لیا کرتا اور لگان کے ایک بہت بڑے حصے کی ادائیگی سے بچ رہتا جو اب وسیع قطعات کی کاشت سے اس کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اس قانون کی مزید وضاحت کے لیے ایک محقق سرمائے اور محنت کی زیادتی کو دوا کی خوراک سے تعبیر کرتا ہے اور زمین کو مریض قرار دیتا ہے۔ اگر کسی زمین کے ایک قطعہ پر کچھ سرمایہ اور محنت صرف کی جائے اور اس کی پیداوار صرف خرچ ہی کے برابر ہو تو اس محقق کی اصطلاح میں ایسی زمین کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ وہ کنارہ زراعت[7] پر ہے۔ رفتہ رفتہ زیادہ سرمائے اور محنت کے صرف سے پیداوار زیادہ ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ جائے گی اور مزید سرمائے اور محنت سے پیداوار میں کوئی متناسب زیادتی نہ ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ سرمائے اور محنت کا حاصل جو مندرجہ بالا قانون کی تحت میں ہے، پیداوار کی مقدار سے متعین ہوتا ہے جو اس سرمائے اور محنت کے عوض میں دستیاب ہوتی ہے۔ پیداوار مذکور کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کو اس حاصل کی تعین میں دخل نہیں ہے۔ ہاں جب ہم اس قانون سے نتائج استخراج کریں گے اور بالخصوص اس اثر پر بحث کریں گے جو آبادی کی زیادتی سے وسائل زندگی پر ہوتا ہے اس وقت قیمت کے تغیرات پر بھی بحث کرنا لازم ہوگا۔ ان تغیرات کو

نفس قانون سے واسطہ نہیں کیونکہ اس کا تعلق پیداوار کی قدر سے نہیں ہے، بلکہ اس کی مقدار سے ہے۔

اس قانون کا عمل عام ہے اور یہ ہر ملک کے حالات پر صادق آتا ہے۔ اس کا اثر صرف مزروعہ زمین [8] تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ چراگاہوں، جنگلوں اور سمندروں کی پیداوار بھی اس قانون کے احاطہ عمل میں ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں کلوں اور دیگر ایجادات کی وجہ سے اس کا اثر چنداں ظاہر نہیں ہوتا۔ مصنوعی اشیاء بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں ہیں کیونکہ ان کا ہیولے یا مصالح [9] جس سے وہ تیار ہوتی ہیں زمین یا سمندر ہی سے برآمد ہوتا ہے مگر مصنوعات کی مختلف اقسام پر اس کا اثر اس محنت کی مقدار کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ جو ان کی تیاری میں صرف کی جائے۔ قینچی کو ہی دیکھو لولوہے کو زمین سے نکالنے کا خرچ اس محنت کے مقابل میں کچھ بھی نہیں جو اس کی تیاری میں صرف کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کان کی مشکلات بڑھ جانے کی وجہ سے لوہے کی قیمت دوگنی بھی ہو جائے تو قینچیوں کی قیمت پر زیادہ [10] اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کی قیمت کے تعین میں اس محنت کو دخل ہے جو ان کی تیاری میں صرف ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو قومیں اس قسم کی دستکاری میں مصروف ہیں جو مصالح پر اپنا عمل کرتی ہیں ان کو اس قانون سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہیں ہے کیونکہ ان کی مصنوعات کی قیمت کم و بیش ان کی دستکاری اور محنت سے متعین ہوتی ہے۔ جس میں مصالح کے خرچ پیداوار کو بہت کم دخل ہے مگر جو ملک زیادہ تر مصالح پیدا کرتے ہیں اور مصنوعات کی تیاری سے عاری ہیں، ان کو اس قانون کے نتائج پر غور کرنا چاہیے بالخصوص ہندوستان کے لوگوں کو۔ کیونکہ ابھی اس ملک کو صنعتی ملک کے نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔ اگر اس ملک کے لوگ زیادہ تر صنعت کی طرف توجہ کریں تو ان کی مالی حالت روز افزوں ترقی کرے گی اور مفلسی کے عذاب اور دیگر مصائب سے نجات ملنے کی صورت نظر آئے گی۔ کیونکہ اور ملکوں کی طرح اس ملک کو مصالح باہر سے منگوانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ جب زمین کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ جاتی ہے تو اس کی قابلیت پیداوار کم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ معمولی کاشت ہی اس کے اندرونی خواص کو زائل کرتی ہے بلکہ بعض چند ایسے قدرتی اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کی زرخیزی کو انتہا درجہ کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ علم طبعی کے نتائج کی رو سے کوئی شے عدم محض نہیں ہو سکتی بلکہ صرف اس کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عدم محض محال ہے۔ تاہم کوئی مفید شے بدل کر ایسی ہیئت یا صورت اختیار کر سکتی ہے جو انسان کے لیے بالکل کارآمد نہ ہو۔ مثلاً جب کوئی مکان

جل کر خاک ہو جاتا ہے تو بالکل معدوم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک مفید ہیئت سے ایک غیر مفید ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ اسی طرح زمین کے مفید اندرونی خواص انسان کے معمولی کاشت یا دیگر مضرت رساں قدرتی اسباب سے حقیقی طور پر فنا نہیں ہو جاتے بلکہ ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو ہماری ضروریات کے لحاظ سے غیر مفید ہوتی ہے۔

زمین کے اس خاصے کی بنا پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان چونکہ صنعتی ملک نہیں ہے، اس واسطے یہ دیگر ممالک کے لیے ایک طرح کا ذخیرہ بن گیا ہے، جہاں وہ اپنے صنعتی کارخانوں کے لیے مصالح حاصل کرتے ہیں اور پھر اس مصالح کو اپنی دستکاری کے عمل سے نئی نئی مصنوعات کی صورت میں تبدیل کر کے دیگر ممالک اور ہندوستان میں بھیج کر بے انتہا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں چونکہ قانون تقابل حاصل کے عمل کو روکنے کے اسباب بہت قلیل ہیں لہٰذا جو اشیاء ہندوستان میں دیگر ممالک سے آتی ہیں ان پر قانوناً بہت سا محصول لگنا چاہیے۔ جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ دیگر ممالک کے تاجر اپنی صنعتی اشیاء اس ملک میں نہ بیچ سکیں گے۔ اگر بیچیں گے تو ان کو کچھ فائدہ کی توقع نہ ہوگی کیونکہ زیادہ محصول کی وجہ سے ان اشیاء کی قیمت گراں ہو جائے گی اور یہاں کے لوگ ان کو خریدنے سے باز رہیں گے۔ اس طرح ہمیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خود اپنا محتاج ہونا پڑے گا اور ہماری صنعت کو ترقی ہو گی۔ اس طریق عمل کو ''حفاظت تجارت'' یا ''تامین تجارت''[11] کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام ممالک باہمی ایک دوسرے کے دست نگر نہ ہوں بلکہ اپنی ضروریات کی چیزیں اپنے اپنے ملک کے پیدا کردہ مصالح سے خود تیار کریں۔ اس دلیل سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مندرجہ بالا طریق عمل کا مقصد قوموں کے باہمی تعلقات کو قطع کرنا ہے۔ یہ نتیجہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تامین تجارت کے مویدوں کا مقصد ہر ملک کے لوگوں کو صنعت کی طرف مائل کرنا ہے، نہ کہ ان کے باہمی تعلقات کو زائل کرنا۔ جو شے کسی ملک میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی وہ بجبوری دیگر ممالک سے حاصل کی جائے گی اور اس طرح تجارتی تعلقات بدستور قائم رہیں گے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مصالح پیدا کرنے والوں اور صنعتی اشیاء کے تیار کرنے والوں کو باہمی خرید و فروخت کرنے میں پوری آزادی حاصل ہے۔ اس واسطے کسی قسم کا محصول[12] لگانا گویا انسان کی آزادی پر حملہ کرنا ہے۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ بسا اوقات کسی خاص فرد کا فائدہ عام افراد قوم کے فوائد سے متناقض ہوتا ہے۔ تاہم مذکورہ بالا دلیل میں دو امور نظر انداز کیے گئے ہیں، جن پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔

(1) اول تو یہ کہ نظام قدرت خود بخود اس کمی کو پورا کرتا ہے جو زمین کی قابلیت پیداوار کے رفتہ رفتہ کم ہوتے جانے سے لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً بڑی بڑی چٹانوں کا تحلیل ہو کر وسیع قطعات زمین کی صورت میں متبدل ہوتے جانا۔

(2) دوئم زمین کے انسانی استعمال میں اس کے کچھ نہ کچھ حصے کا ضائع ہونا ضروری ہے۔ بلکہ بڑے بڑے تجارتی قصبوں کی تعمیر سے بھی یہ بات رک نہیں سکتی اور کچھ نہیں تو ایسے قصبوں میں کچھ حصہ زمین ان شہروں کی تیاری ہی میں صرف کرنا پڑے گا جن کی وساطت سے کوڑا کرکٹ وغیرہ سمندر میں پھینکا جاتا ہے۔

قصہ کوتاہ یہ بحث بڑی دل چسپ ہے اور اس کے نتائج مختلف ممالک کے حالات پر منحصر ہیں۔ ہم اس پر زیادہ خامہ فرسائی نہیں کرنا چاہتے۔ بلکہ اس کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔

حوالہ جات:۔

(1) Place Utility (مرتب)

(2) Time Utility (مرتب)

(3) Form Utility (مرتب)

(4) Productivity (مرتب)

(5) Law of Dminishing Returns (مرتب)

(6) OPtimum Point یعنی وہ نقطہ جس پر عاملین پیداوار کے درمیان بہترین توازن قائم ہو جائے اور جس کے بعد پیداوار میں مزید اضافہ مصارف میں غیر متناسب اضافہ کے بعد ہی ممکن ہو۔ دوسرے الفاظ میں وہ نقطہ جس کے بعد تقلیل پیداوار کا عمل ہوتا ہے شروع (مرتب)

(7) یعنی Margin of Cultivation۔ (مرتب)

(8) Cultivated land۔ (مرتب)

(9) مصنف نے ''مصالح'' کا لفظ خام مال Raw Material کے لیے استعمال کیا ہے۔ (مرتب)

(10) اصل مسودہ میں لفظ ''کچھ'' استعمال ہوا ہے جو حقیقت کی صحیح عکاسی نہیں کرتا۔ اس لیے ''کچھ'' کی جگہ ''زیادہ'' کر دیا گیا ہے تا کہ مفہوم زیادہ بہتر طریقہ پر واضح ہو جائے۔ (مرتب)

(11) Protection (مرتب)

(12) Tax (مرتب)

باب دوم

محنت

دولت کی پیدائش کا دوسرا وسیلہ محنت ہے۔ جس سے مراد وہ جسمانی یا غیر جسمانی (دماغی) سعی ہے جو کسی مقصد کے حصول کے لیے کی جاتی ہے۔ قطع نظر اس خوشی یا لذت کے جو اس سعی کے دوران میں حاصل ہو۔ قدرت مصالح یا ہیولیٰ مہیا کرتی ہے۔ مگر محنت اس کے مختلف اقسام پر اپنا عمل کرنے سے یا ان کو مطلوبہ ہیئت میں تبدیل کرنے سے اس ہیولیٰ کو انسانی ضروریات کے پورا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اس قمیص کو ہی لو جو تم پہنتے ہو۔ اس کو موجودہ مفید صورت میں لانے کے لیے محنت کے مختلف اعمال کا کس قدر طویل سلسلہ درکار ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مصنفین اور علماء کی تصانیف جن کا منشا قوم کی اصلاح کرنا یا علوم کی اشاعت وغیرہ ہو، خالص دماغی محنت کی مثالیں ہیں۔

تہذیب و تمدن کے اقل درجہ کی حالت میں انسان کی ضروریات قدرتی کی فیاضی سے خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ محنت کی احتیاج نہیں ہوتی اور جب تک یہ حالت قائم رہتی ہے اشیاء میں وہ خاصیت بھی پیدا نہیں ہوتی جس کو قدر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انسان دیگر حیوانات کی طرح خود رو پھلوں پر یا شکار پر گزران کرتا ہے۔ اس حالت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کم ہو، قحطوں کا تواتر ہو، اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے قبائل انسانی میں باہمی جنگ و جدل کا سلسلہ قائم رہے۔ مگر جب انسان اس وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے حالت شبانی تک پہنچتا ہے تو اقتصادی معنوں میں محنت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حالت میں بنی آدم قدرت کی فیاضی کے بھروسے ہی نہیں رہتے بلکہ مختلف جنگلی حیوانوں کو اپنے قبضے میں لاتے ہیں۔ پانی کے غیر مستقل ذخیرہ کے لیے نہریں کھودتے ہیں بلکہ آئندہ خشک سالی کی فکر سے خورد و نوش کا سامان جمع کرنا اور اپنے حیوانوں کی حفاظت کرنا بھی سیکھتے ہیں۔ غرض کہ محنت کی مندرجہ بالا صورتوں کی وساطت سے وہ تمام اشیاء دولت بن جاتی ہیں جو انسان کی وحشیانہ حالت میں

اس خاصیت سے معرا تھیں۔ تمدن کی اس حالت میں آبادی دن بدن زیادہ ہوتی ہے اور خورونوش کا سامان صرف کثیر ہی نہیں ہوتا بلکہ بیرونی خطرات سے محفوظ بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی ذاتی محنت سے قحطوں کا تواتر رک جاتا ہے اور ان کے گزارے کی سبیل یقینی ہو جاتی ہے۔ آخر کار یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے اور انسان ترقی کر کے اس حالت تک پہنچتا ہے جس کو حالت زراعتی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ خانہ بدوشی چھوٹ جاتی ہے، آبادی زیادہ ہوتی جاتی ہے اور محنت کا ہاتھ زمین کے مخفی خزانوں کو غلہ اور دیگر اجناس کی صورت میں نکالنا شروع کرتا ہے۔

اوپر کی سطور سے واضح ہو گیا ہوگا کہ پیدائش دولت کے لیے محنت لازم ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر محنت دولت آفریں (1) نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کی دو بڑی اصناف قرار دی گئی ہیں۔ یعنی

(1) محنت بارآور۔ اور

(2) محنت غیر بارآور۔

مقدم الذکر سے مراد وہ محنت ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مسلسل طور پر مزید دولت پیدا کرتی رہے۔ اور آخر الذکر سے مراد اس محنت کی ہے جو مسلسل طور پر مزید دولت پیدا نہ کر سکے۔ مثلاً مفید اور ضروری اشیاء تیار کرنے والے معماروں، آہنگروں یا سپاہیوں اور استادوں کی محنت بارآور ہے۔ برخلاف اس کے آتش بازی بنانے والے کی محنت غیر بارآور ہے کیونکہ آتش بازی کا دستکار بجائے اس کے کہ مسلسل طور پر مزید دولت پیدا کرے قومی دولت کو کم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ کسی جگہ صرف دو آدمی آباد ہیں۔ ایک کے پاس دس روپے ہیں اور دوسرے کے پاس پانچ۔ یعنی ان کا کل سرمایہ پندرہ روپیہ ہے۔ فرض کرو کہ جس شخص کے پاس پانچ روپے ہیں وہ اپنا سرمایہ آتش بازی کی تیاری میں صرف کرتا ہے اور شے مذکور کے تیار ہونے پر اسے اپنے تماشہ پسند ساتھی کے پاس لے جاتا ہے جو آتش بازی کو دس روپے پر خرید لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا سرمایہ جو پہلے پندرہ روپے تھا اب صرف دس روپے رہ گیا ہے۔ جو آتش باز کے قبضے میں ہے۔ کیونکہ آتش بازی اپنے مالک کو ایک عارضی خوشی دے کر تھوڑی دیر کے بعد بالکل معدوم ہو جائے گی لہٰذا تمام غیر بارآور محنت جو اسباب تن آسانی پر صرف ہوتی ہے اگرچہ بادی النظر میں سرمایہ داروں کو محنت بارآور کے مانند منافع خیز معلوم ہوتی ہے (جیسا کہ مثال بالا میں ہمارے آتش باز کو اپنی تجارت سے پانچ روپیہ منافع معلوم ہوتا ہے) تاہم انجام کار قومی دولت کی مقدار کو کم کرتی ہے کیونکہ یہ محنت اور سرمایہ جو اس پر صرف ہوتا ہے گویا ایسی

اشیاء کی تیاری میں صرف ہوتا ہے. جو کچھ عرصہ کے بعد قدر سے معرا ہو کر بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اور اس وجہ سے مسلسل طور پر مزید دولت کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ اگر غور سے دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ بخیلوں اور عشرت پسندوں کا وجود قومی دولت کے لیے یکساں مضرت رساں ہے۔ بخیل بھی عشرت پسندوں کی طرح دولت کو ایک طرح سے فنا ہی کرتا ہے کیونکہ جو دولت صندوق میں بند رہے، اور مزید دولت کے پیدا کرنے میں صرف نہ ہو اس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ غرضیکہ محنت کا بارآور یا غیر بارآور ہونا اور سرمایہ کا بارآور یا غیر بارآور طور پر استعمال ہونا مزید دولت پیدا کر سکنے یا نہ کر سکنے کی قابلیت پر منحصر ہے۔ معلم کی محنت بارآور ہے کیونکہ وہ اوروں کو اس قابل بناتا ہے کہ مزید دولت پیدا کریں۔ علیٰ ہذا القیاس سپاہی کی محنت بھی بالواسطہ بارآور ہے، کیونکہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرتا ہے جو مزید دولت کے پیدا ہونے کی ایک ضروری شرط ہے۔ اسی طرح دیگر دستکاروں یعنی معماروں، آہنگروں وغیروں کی محنت بھی بشرطیکہ اسباب تن آسانی پر صرف نہ ہو بارآور ہے۔ کیونکہ ان کی محنت سے ایسی اشیاء تیار ہوتی ہیں جن سے سلسلہ وار مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ برخلاف گوٹا بنانے والے کی محنت کے، کہ اس کا نتیجہ ایک ایسی شے ہے جو خریدنے والے کو ایک عارضی خوشی یا آسائش تو دیتی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو کر دولت کی آئندہ پیدائش کے سلسلہ کو یک قلم منقطع کر دیتی ہے۔ مندرجہ بالا امتیاز کی بنا اس امر پر ہے کہ ہر ملک میں بعض دستکار اور سرمایہ دار تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنی محنت اور سرمائے کو ضروریات زندگی کے پیدا کرنے میں صرف کرتے ہیں اور بعض صرف اسباب عشرت و تن آسانی ہی کو پیدا کرتے ہیں لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے حالات زندگی، اس کے خیالات اور قویٰ میں ایک قسم کا تغیر آتا رہتا ہے، جس سے یہ امکان ہو جاتا ہے کہ جو چیز سو سال پہلے اسباب تن آسانی میں سے تصور کی جاتی تھی اب اخلاقی حالات کی وجہ سے ضروریاتِ زندگی میں شمار کی جائے۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج میں ضروریات زندگی اور اسباب تن آسانی یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ محنت بارآور اور غیر بارآور میں تمیز کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا توضیح پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں۔

(ا) فرض کرو کہ ایک استاد بیس لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے۔ جن میں سے آخر کار دس طلباء معزز عہدوں پر ممتاز ہوئے۔ مگر باقیوں نے مرفہ الحال ہونے کی وجہ سے کوئی ملازمت یا تجارت وغیرہ نہ

کی۔ ظاہر ہے کہ محنت بارآور کی تعریف کی رو سے استاد کی محنت کا وہ حصہ جو پہلے دس کی تعلیم پر صرف ہوا ہے، بارآور ہے کیونکہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہو رہی ہے، لیکن وہ حصہ جو باقی دس کی تعلیم پر صرف ہوا ہے، غیر بارآور ہے کیونکہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کی محنت ایک حالت میں بارآور اور دوسری حالت میں غیر بارآور ہو؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ علم اقتصاد واقعات کے اسباب و علل معلوم کرتا ہے اور اس بات پر بحث کرتا ہے کہ اگر بعض مانع اسباب نہ پیش آئیں تو فلاں واقعہ اس طرح ظہور پذیر ہوگا۔ استاد کی محنت دونوں صورتوں میں بارآور ہونے کا میلان رکھتی ہے، لیکن چونکہ دوسری صورت میں طلباء کی بے پروائی یا دیگر موانع پیش آ گئے ہیں، اس واسطے غیر بارآور ہو گئی ہے۔

(۲) تم شاید یہ کہو گے کہ اگر کسی شے کے بارآور استعمال سے یہی مراد ہے کہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہوتی جائے تو جو روپیہ ہم لنگڑوں، اپاہجوں اور معذوروں کو بطور خیرات کے دیتے ہیں وہ بھی غیر بارآور طور پر صرف ہوتا ہے کیونکہ اس سے کوئی مزید دولت پیدا نہیں ہوتی۔ بے شک یہ خیال صحیح ہے اور اسی خیال سے ایک مشہور انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ علم الاقتصاد کے اصول اور نتائج انسان کے ذاتی تاثرات کے صریح مخالف ہیں، لیکن یاد رہے کہ اگر اس علم کے اصول کی رو سے خیرات کا روپیہ غیر بارآور طور پر صرف ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ خیرات دینی ہی نہیں چاہیے۔ علم الاقتصاد واقعات پر بحث کرتا ہے، نہ کہ فرائض انسان پر۔ نظری طور پر کسی امر کا صحیح ہونا اس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ وہ امر اس وجہ سے ہمارے فرائض سے ہی خارج ہے۔ فرائض انسان کی تعیین علم الاقتصاد کا کام نہیں ہے بلکہ ان کا فیصلہ علم اخلاق کے اصول پر ہوتا ہے۔ جو بحیثیت ایک علم ہونے کے علم الاقتصاد سے الگ ہے۔ بلکہ اگر تم غور کر کے دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ نظام تمدن کے بقا اور اس کے استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ قومی دولت کا کچھ حصہ فنا بھی ہوتا رہے۔

اس امتیاز کا اصلی مفہوم ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی ملک میں محنت کی پیداوار کا کم و بیش ہونا مندرجہ ذیل اسباب پر منحصر ہے، خواہ وہ ملک حالت شبانی میں، خواہ زراعتی حالت میں، خواہ تہذیب و تمدن کے اس درجہ پر ہو جبکہ صنعت و تجارت انتہائے عروج پر ہوتی ہیں:۔

(1) دستکاروں یا محنتیوں کی کارکردگی [2]۔

(2) انقسام محنت [3] یا محنت کے مختلف اعمال اور حصص کا مختلف افراد پر تقسیم کرنا اور اس طریق سے ان کی تخصیص و تنظیم کرنی۔

محنت کی کارکردگی

محنتی کی کارکردگی کئی اسباب پر منحصر ہے۔

(اول) اس کی موروثی ہمت یا قوئ جو فطرت نے اسے عطا کیے ہوں۔ قدرت کا عطیہ مختلف اقوام کی حالت میں مختلف ہے۔ بعض قومیں قدرتاً قوی اور مضبوط ہوتی ہیں۔ بعض قدرتاً دبلی پتلی اور مقابلتاً ضعیف۔ یہی حال افراد کا ہے مگر اس اختلاف کی علت پر بحث کرنا علم الاقتصاد کا کام نہیں ہے۔

(دوم) محنتی کی غذا کی کیفیت اور کمیت۔

(سوم) محنتی کا سامان حفظ صحت، صاف اور ہوادار مکانوں میں رہنے سے اس کی صحت پر ایک نمایاں اثر ہوگا جس سے اس کی ہنرمندی ترقی کرے گی۔

(چہارم) محنتی کی فطرتی ذہانت۔ ذہین محنتی بہ نسبت غبی محنتی کے کئی وجوہ سے زیادہ اچھا کارکن ہوتا ہے۔

(1) تو اسے اس امر کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اس کی شاگردی کی مدت طویل ہو۔

(2) اس پر نگرانی کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

(3) وہ اشیاء کی تیاری میں کم نقصان کرتا ہے۔

(4) وہ کل کا استعمال جلد سیکھ جاتا ہے۔

(5) زندگی کی دوڑ میں بڑھنے کی آرزو، جو کچی خودداری اور غیرت سے پیدا ہوتی ہے اور اس امر کا یقین کہ پیداوار محنت کی افزائش کے ساتھ اس کا حصہ بھی بڑھتا جائے گا۔

مندرجہ بالا اسباب میں سے پہلے تین اسباب طبعی ہیں۔ چوتھا عقلی اور پانچواں اخلاقی ہے۔ تم کو معلوم ہے غلاموں کی محنت آزاد محنتیوں کی محنت کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ غلاموں کی محنت کارکردگی کی وقعت سے کیوں معرا ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ آزاد محنتیوں کی طرح اسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور اپنے

ہمراہیوں پر فوقیت لے جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ تازیانہ کا خوف ان قویٰ کو حرکت میں نہیں لاسکتا جن کی تحریک صرف تمنائے دولت اور خودداری کی خلش سے ہوتی ہے۔ آزاد محنتیوں کی صورت میں بھی اجرت کا قطعی اور یقینی ہونا ان کے لیے انتہا درجہ کا قوی محرک ہوتا ہے اور اگر کسی مالک کا نہیں بلکہ اپنا کام کر رہے ہوں، تو اپنی محنت کی کارکردگی کے زیادہ کرنے میں اور بھی کوشش کرتے ہیں۔ وجہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی محنت کی پیداوار کا پورا مالک تصور کرتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ "حق ملکیت ایک اکسیر ہے جو تانبے کو سونا بنا دیتا ہے۔" یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض ممالک میں قانون ہی کچھ اس ڈھب کے وضع کیے جاتے ہیں کہ قوم کے دستکاران کے اثر سے دن بدن سست ہوتے جاتے ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات یہ قانون ان کو اپنی محنت کا پورا فائدہ اٹھانے سے روکتے ہیں۔ کچھ عرصہ گزرا ہے ملک سکاٹ لینڈ میں قوانین متعلقہ مزارعین اس طرح سے وضع کیے گئے تھے کہ ان بیچاروں کی جانکاہی، کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان لوگوں کے مزاج میں دن بدن کاہلی ترقی کرتی گئی مگر جب اس قسم کے بے ہودہ قوانین منسوخ کر دیے گئے تو انہوں نے اپنی جبلی چستی اور استقلال کو پھر حاصل کر لیا۔ پس یہ تمام اسباب ہیں جو محنت کی کارکردگی میں اختلاف پیدا کرتے ہیں۔

انقسام محنت

کسی قوم کی قوت محنت [4] کا دوسرا جزو انقسام محنت ہے۔ تہذیب وتمدن کے ابتدائی مراحل میں ہر انسان اپنی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے سارا کام خود کرتا ہے۔ اپنی جھونپڑی کا معمار بھی آپ ہی ہوتا ہے اور اپنے شکار کے لیے تیر و کمان اور دیگر اوزار بھی آپ ہی تیار کر لیتا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی کسی نہ کسی حد تک انقسام محنت کا اصول عمل میں ضرور آتا ہے۔ عورت سوت کاتتی ہے، پہننے کے لیے کپڑے تیار کرتی ہے، کھانا پکاتی ہے لیکن مرد اور کام کرتا ہے جن میں قوت اور چستی کی زیادہ ضرورت ہے۔ رفتہ رفتہ محنت کا انقسام جنسیت کے امتیاز پر مبنی نہیں رہتا بلکہ ذاتی قابلیت کے اختلاف پر مبنی ہو جاتا ہے۔ افراد میں سے کوئی لوہار، کوئی زرگر، کوئی بڑھئی بن جاتا ہے اور اس طرح آخر کار ہر پیشہ کے مختلف حصے مختلف محنتیوں کے ساتھ مختص ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر ممالک میں ذات پیشہ کے لحاظ سے قرار دی جاتی ہے۔ ہندوستان کو ہی لو، ہمارے ہاں اصول انقسام محنت کا اثر اس درجہ تک

ہوا کہ درزی، لوہار، بڑھئی وغیرہ ذاتیں قرار پا گئیں اور اس امتیاز پر اس قدر بے جا زور دیا گیا کہ اس کے مضرت رساں نتائج بالکل نظر انداز کر دیئے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں یہ امتیاز قوموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے، لیکن کسی شے کے ایک خاص صورت میں مفید ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شے ہر حالت میں مفید ہے۔

انقسام محنت سے دولت کی پیداوار روز افزوں ترقی کرتی ہے۔

(1) اس کی وجہ سے شاگردی کی مدت کم ہو جاتی ہے کیونکہ جب محنتی کو کسی پیشے کا صرف ایک خاص حصہ ہی سیکھنا ہوگا تو ظاہر ہے کہ اس کے سیکھنے کی مدت اس مدت سے بہت کم ہوگی جو اس پیشہ کی تمام شاخوں کے سیکھنے میں صرف ہوتی۔

(2) ایک خاص شاخ کی مزاولت سے اس کے ہاتھ کی صفائی بڑھ جائے گی۔

(3) جب ایک محنتی کسی پیشے کی ایک خاص شاخ کے لیے مختص ہو جائے گا تو اس کو اس پیشے کی دیگر شاخوں سے کوئی سروکار نہ ہوگا اور عدم انقسام کی صورت میں جو وقت ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف جائے اور پیشے کے مختلف اعمال کی ادل بدل میں صرف ہوتا تھا۔ انقسام محنت کی صورت میں بچ جائے گا۔

(4) چونکہ ہر محنتی کی توجہ پیشے کی کسی خاص شاخ یا عمل پر مبذول رہا کرے گی اس واسطے وہ اپنے مقررہ کام کو سہولت، آسانی اور صفائی کے ساتھ سرانجام دینے کی راہیں ایجاد کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگرچہ دنیا کی بڑی بڑی ایجادات علمی ترقی کا نتیجہ ہیں، تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا بہت سا حصہ اصول انقسام محنت کے اثر سے ظہور میں آیا ہے۔

(5) انقسام محنت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ کام محنتیوں کی قابلیت کے مطابق تقسیم ہوگا۔ لہٰذا بچے اور عورتیں بھی اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ملک کی دستکاری سے بہرہ ور ہوں گی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ تو تمہیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ انقسام محنت کسی ملک کی صنعت کے لیے کہاں تک مفید ہے، لیکن اگر اسی اصول کو دنیا کی تمام اقوام و ممالک پر وسعت دی جائے یا یوں کہو کہ محنت کی مقامی تقسیم کی جائے تو اس کے فوائد اور بھی نمایاں ہوں گی۔ ہر ملک وہی شے پیدا کرے گا جس کے پیدا کرنے کی قابلیت اسے خصوصیت کے ساتھ حاصل [5] ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ ملک اس خاص شے کے پیدا کرنے میں کمال حاصل کرتا جائے گا[6]۔

جو لوگ اصول "تامین تجارت"[7] کے مخالف ہیں۔ ان کی بڑی دلیل یہی ہے کہ قوموں کے تجارتی تعلقات پر کسی قسم کی روک پیدا کرنا گویا لوگوں کو ان بڑے بڑے فوائد سے محروم کرنا ہے جو محنت کی مقامی تقسیم کا نتیجہ ہیں کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اسی ملک یا بازار سے خریدے جہاں وہ کم سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔

تم جانتے ہو کہ ہر قوم کے تمدنی اور ملکی حالات کم و بیش مختلف ہیں۔ لہٰذا ان کی دستکاری میں بھی کم و بیش اختلاف ہے۔ کسی کو کسی شے کی تیاری میں کمال حاصل ہے یا ملکی اور قومی حالات کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور کسی کو کسی اور شے کی تیاری میں۔ اگر اس قدرتی امر کو ملحوظ خاطر رکھ کر دنیا کی محنت کو اس طور پر مرتب و منظم کریں کہ ہر ملک انہیں اشیاء کے پیدا کرنے میں مصروف رہے جن کے تیار کرنے میں اسے خاص طور پر قابلیت حاصل ہے یا یوں کہو کہ دستکاری کی مختلف شاخیں ایک نہ ایک قوم یا مقام کے ساتھ مختص سمجھی جائیں تو ظاہر ہے کہ اس تنظیم سے بے انتہا فوائد منتج ہوں گے۔ محنت کی کارکردگی پر ایک نمایاں اثر ہوگا۔ بنی نوع انسان ایک بڑے جسم کی طرح ہیں، کہ مختلف ممالک یا اقوام اس کے اعضاء ہیں، جو اپنے اپنے مقررہ فرائض کی انجام دہی سے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کا پورا مفہوم ظاہر کرتے ہیں اور اس طرح جسم کی پرورش اور ترتیب کرتے ہیں۔ پس قطع نظر ان فوائد کے جو انقسام محنت سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، تنظیم محنت کا اول تو یہ فائدہ ہوگا کہ دستکاری کی مختلف شاخوں کی تقسیم سے مختلف پیشہ وروں کے کام کی خوبی کا مقابلہ ہو سکے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے درمیان ایک قسم کا رشک پیدا ہو جائیگا اور پیشہ ور اس رشک کے جوش میں سعی کرے گا کہ اس کا کام خوبی میں اوروں کے کام سے بہتر ہو۔ علاوہ اس کے تنظیم محنت کی وجہ سے مالکوں یا کارخانہ داروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے گی جو اپنی ذات منفعت کی خاطر ہمیشہ یہ سوچتے رہیں گے کہ ملک کی دستکاری مفید ترین راہوں میں صرف ہو۔ اگرچہ مالکوں کی ایک علیحدہ جماعت کے قائم ہو جانے سے اول اول کسی قدر نقصان ہوگا کیونکہ دستکار کو اپنے کام میں وہ ذاتی دلچسپی نہ رہے گی تاہم مجموعی طور پر اس جماعت کا اثر مفید ہوگا۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ تنظیم محنت کے لیے یہ ضروری ہے کہ دستکاری کے مختلف مرکزوں کے درمیان پیام رسانی اور ارتباط کے دیگر ذرائع کا پورا انتظام ہو۔ ورنہ بیگانگی اور عدم تعلق سے بعض اوقات خوفناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہوگا۔

۱۸۶۰ء میں جبکہ ممالک مغربی وشمالی ایک ہیبت ناک قحط کی مصیبت سے پامال ہو رہے تھے۔ بعض اضلاع میں چاول کا نرخ چار روپیہ فی من تھا مگر بعض اضلاع میں دو روپیہ من سے بھی کم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف اضلاع کے درمیان تجارتی تعلقات کو قائم رکھنے کے لیے کافی سڑکیں موجود نہ تھیں جن کی وجہ قحط زدہ اضلاع ان اضلاع کی پیداوار سے فائدہ اٹھا سکتے جن میں مقابلۃً ارزانی تھی۔ موجودہ حکام ہندوستان کی دوراندیشی سے اب اس ملک کے مختلف حصص میں تجارتی تعلقات پیدا ہونے کا سامان دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ آئندہ اس قسم کا دردناک مصائب کا تواتر نہ ہوگا۔ اس ضرورت کے لحاظ سے ایک محقق اس بات پر زور دیتا ہے کہ بستیاں آباد کرنے والوں کے قطعات زمین قریب قریب ہونے چاہئیں ورنہ ہر جماعت صرف وہی اشیاء پیدا کرے گی جو ان کی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے کافی ہوگی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کے درمیان تجارتی تعلقات پیدا نہ ہوں گے اور ان کو ان تمام خطرات کا اندیشہ رہے گا جو عدم سلسلہ آمدورفت سے پیدا ہوتے ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر گزشتہ دو باتوں کی بحث کا نتیجہ تحریر کرتے ہیں تاکہ مندرجہ بالا امور وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائیں۔ باب دوئم میں تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ پیدائش دولت کے قدرتی اسباب ایک بڑے قانون کے تابع ہیں جس کو قانون تقلیل حاصل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر باب سوم میں ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ یہ واضح کریں کہ تنظیم محنت سے پیدائش دولت انتہا درجہ کی ترقی کرتی ہے۔ اگر قانون تقلیل حاصل کی رو سے پیداوار دولت میں نقطہ تقلیل تک پہنچ کر دن بدن کم ہوتے جانے کا میلان ہے، تو تنظیم محنت فن زراعت کی ترقی اور اس فن کی دیگر متعلقہ ایجادات اور سرمایہ کا زیادہ دوراندیشی سے استعمال کرنا اس کی افزائش کے اسباب ہیں۔

انسان کی آبادی دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ اس کی ضروریات بھی بڑھتی جاتی ہیں لہٰذا اگر وہ صرف قدرتی اسباب کی پیدائش کے بھروسہ پر رہتا اور اپنی روز افزوں ضروریات کے پورا کرنے کی نئی نئی راہیں نہ نکالتا یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اپنی عقل کے زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا، تو اس امن وآسائش میں انتہا درجہ کا خلل پیدا ہوتا بلکہ اس کی نسل کی بقا ہی محال ہو جاتی۔ پس ظاہر ہے کہ اصول تنظیم محنت اور اصول تقلیل حاصل ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ جن میں ایک قسم کی جنگ چلی جاتی ہے جس سے پیدائش دولت میں اعتدال قائم رہتا ہے اور اعتدال ہی ہر شے کی جان ہے۔

حوالہ جات:-

(1) Productive (مرتب)

(2) Efficiency of Labour (مرتب)

(3) Division of Labour(مرتب)

(4) کسی قوم کی قوت محنت سے مراد اس قوم کے دستکاروں کی تعداد، ان کا ہنر اور ان کی ذہانت وغیرہ

(5) یہاں جملے کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے الفاظ کی ترتیب میں ادنیٰ تغیر کیا گیا ہے۔(مرتب)

(6) علم الاقتصاد میں اس نظریہ کو "نظریہ تقابلی مصارف" (Theory of Comparative Cost) اور "اصول علاقائی تخصیص" (Principle of Regional Specialisation) کہتے ہیں۔(مرتب)

(7) Protective Trade۔(مرتب)

باب سوم

سرمایہ

نوع انسانی کے ابتدائی مراحل تہذیب میں سرمایہ کا وجود مطلق نہ تھا۔ پیداوار دولت کے صرف دو وسائل تھے۔ یعنی محنت اور زمین۔ مگر موجودہ نظام تمدن میں سرمایہ دولت کی پیدائش کے لیے ایسا ہی ضروری ہو گیا ہے جیسا کہ محنت اور دیگر قدرتی اسباب۔ اس لیے دولت کی پیدائش ناممکن ہے جب تک کہ موجودہ صرف میں سے کچھ حصہ بچا کر مزید دولت کے پیدا کرنے میں استعمال نہ کیا جائے۔ لہٰذا نظام تمدن کی موجودہ صورت میں کسی ملک کا سرمایہ اس ملک کی دولت کا وہ حصہ ہے جو دولت کی آئندہ پیدائش کے لے الگ رکھا جائے[1]۔ کسی کی دولت کا وہ حصہ جو اسباب تن آسانی پر صرف کیا جاتا ہے یا اسباب تن آسانی کی تیاری میں لگایا جاتا ہے بادی النظر میں تو سرمایہ دار کو نفع دیتا ہے لیکن چونکہ انجام کار قومی دولت پر اس کا اثر اچھا نہیں ہوتا اس واسطے علم اقتصاد کے اصول کی رو سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ حصہ بطور سرمایہ صرف ہوا ہے۔ بلکہ اس کے استعمال کو غیر بار آور ہی کہا جائے گا بشرطیکہ یقینی اور قطعی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اشیاء جو اس حصہ دولت کی وساطت سے تیار ہوئی ہیں یا خریدی جاتی ہیں، واقعی اسباب تن آسانی میں داخل ہیں۔ غرض کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور سرمایہ دار کے کم خرچ اور کفایت شعار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

بعض مصنفین کہتے ہیں کہ کسی ملک کی آب و ہوا بھی جہاں تک کہ مزید دولت کی پیداوار میں مدد دیتی ہے، اس ملک کے سرمائے کا حصہ ہے، لیکن چونکہ دولت وہ شے ہے جو تبادلے میں کوئی معین قدر رکھتی ہو۔ اس واسطے کسی ملک کے مفید قدرتی اسباب مثلاً آب و ہوا یا اس کا جغرافی مقام وغیرہ اس ملک کے سرمائے میں داخل نہیں تصور کیے جا سکتے اگرچہ یہ پیدائش دولت کے ممد ضرور ہیں۔ سرمائے کی اصلیت مندرجہ ذیل مثال سے واضح ہو سکتی ہے۔ فرض کرو کہ انسانوں کا ایک قبیلہ سمندر کے کنارے پر

آباد ہے اور مچھلی پر گزارہ کرتا ہے۔ جب مچھلی کثرت سے پیدا ہوتی ہے تو ان کے دن بھی اچھے گزر جاتے ہیں مگر برعکس حالات میں ان لوگوں کو قحط کی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ اب فرض کرو کہ ان میں سے ایک آدمی اپنے ہم جنسوں کی نسبت امیرانہ گزارہ کرنے کی خاطر مچھلی کا ایک ذخیرہ جمع کرتا ہے۔ یہ ذخیرہ دولت تو ضرور ہے مگر اس کا سرمایہ ہونا اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ اگر غیر بارآور طور پر استعمال ہوگا تو بطور سرمایہ صرف نہ ہوگا لیکن اگر مزید دولت کی پیدائش میں صرف ہوگا تو سرمایہ کہلائے گا۔ بالفرض قحط کے موسم میں یہ شخص اپنے ذخیرے کو ساتھ لے کر کسی جنگل کی طرف نکل جاتا ہے اور وہاں جا کر فراغت سے ایک کشتی تیار کرتا ہے جس کی وساطت سے سمندر کے دور دراز حصوں میں اس کی رسائی ہو سکتی ہے جہاں ساحل کی نسبت زیادہ مچھلی مل سکتی ہے۔ اس صورت میں کشتی مذکور سرمایہ کہلائے گی اور یہ شخص سرمایہ دار ہوگا۔

اب اس شخص کے لیے تین راہیں کھلی ہیں۔

(اول) تو یہ کہ اپنی کشتی خود استعمال کرے اور ماہی گیری کی آمدنی سے اپنے ہم جنسوں کی محنت ایک خاص معاوضے کے بدلے خریدے، اور اس طرح آرام میں بسر کرے۔

(دوم) یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارے پر دے دے اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر میں بیٹھا رہے۔

(سوم) یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارے پر دے دے اور خود اور کشتیاں تیار کرنے میں مصروف رہے۔ فرض کرو کہ کشتی بنانے والا تیسری راہ اختیار کرتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صنعت کے گاہک بہت ہیں۔ جوں جوں وہ زیادہ کشتیاں تیار کرے گا توں توں اس کا ہاتھ بھی صاف ہوتا جائے گا اور وہ دن بدن اس قابل ہوتا جائے گا کہ اجرت کے معاہدے پر اپنے دیگر ہم جنسوں کو بھی اپنے ساتھ کام میں لگائے۔ کیونکہ خریداروں کی کثرت کی وجہ سے وہ اکیلا اتنی کشتیاں نہیں تیار کر سکے گا۔ اب اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر اوروں کو بھی کشتیاں بنانے کی تحریک ہوگی اور کشتی گروں میں ایک قسم کی تجارتی رقابت[2] ہو جائے گی اور منافع کی شرح کم ہوتی جائے گی۔ آخرکار یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ کشتیوں کی مزید مانگ نہ رہے گی اور اس وجہ سے سرمایہ دار کمی منافع کے خیال سے کشتی گری کو چھوڑ کر معماری کے کام پر اپنا سرمایہ صرف کرنے لگیں گے یا قبیلے کی دیگر ضروریات کا سامان مہیا کریں گے۔ اس طرح جوں جوں قبیلے کی ضروریات بڑھتی جائیں گی یا یوں کہو کہ جوں جوں قبیلہ مذکور تہذیب و تمدن میں ترقی کرتا جائے گا توں توں اس کا سرمایہ بھی مختلف صورتیں اختیار کرتا جائے گا۔

مثال مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ اول اول ذخیرے کی صورت میں ظاہر ہوا کیونکہ کشتی بنانے والے کے لیے یہ ضروری تھا کہ پہلے ایام کشتی گری کے لیے اپنی خورونوش کا سامان مہیا کرے۔ اس کے بعد سرمایہ کشتی گری کے اوزاروں کی صورت اور بالآخر اس مصالح کی صورت میں جس سے کشتیاں تیار ہوتی ہیں، منتقل ہو گیا۔ غرض کہ ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی قوم کا سرمایہ اس قوم کی دولت کا وہ حصہ ہے جو دولت کی نئی نئی صورتیں پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جس کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقہ پر ہو سکتی ہے۔

(۱) وہ سرمایہ جو مزید دولت کی پیدائش کے ایام میں سرمایہ داروں اور محنتیوں کی خورونوش میں صرف ہو۔

(۲) اوزار۔ یعنی مختلف پیشوں کے ہتھیار۔ آلات اور کلیں وغیرہ۔

(۳) مصالح۔ جس میں دولت کی وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو سامان معاش اور اوزاروں کے علاوہ ہوں۔

مقدم الذکر صورت میں اسے سرمایۂ دائر [3] کہتے ہیں کیونکہ یہ ایک ہیئت سے منتقل ہو کر دوسری ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً محنتیوں کی اجرت' ان اشیاء خورد و نوش کی چیزیں قوئی حیات کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ موخر الذکر دو صورتوں میں اسے سرمایہ قائم [4] کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیونکہ سرمایہ مذکور ایک مستقل اور غیر متبدل ہیئت اختیار کر لیتا ہے جس سے رفتہ رفتہ مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ تہذیب و تمدن کی عام حالتوں میں سرمایہ انہی تین صورتوں میں استعمال کیا جاتا ہے لیکن زمانہ حال کے مہذب ممالک میں اشیاء مادیہ کے علاوہ اعتبار [5] اور حقوق مجردہ [6] مثلاً حق نالش وغیرہ بھی سرمایہ کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ زمانہ حال میں ہزارہا سوداگر اپنے ذاتی اعتبار پر تجارتی اشیاء خرید کرتے اور ان کی فروخت سے نفع اٹھاتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس زمانہ حال کی تجارت کا بہت بڑا حصہ حقوق نالش اور دیگر حقوق مثلاً حق تصنیف وغیرہ کی خرید و فروخت کے متعلق ہے۔

دنیا میں بہت سے ملک ہیں جن کو قدرت نے صنعت و حرفت اور دستکاری کے دیگر اقسام کے لیے نہایت موزوں پیدا کیا ہے، لیکن سرمایہ کی کمی یا عدم موجودگی کے باعث ان کی تجارت چمک نہیں سکتی۔ ہمارے ہندوستان کو بھی اس مصیبت کا سامنا ہے یہاں کی تجارت بیشتر مغربی سوداگروں کے ہاتھوں میں ہے جو اپنے سرمایہ کو ہندوستانی تجارت کی مختلف شاخوں میں لگا کر نفع عظیم حاصل

کرتے ہیں لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ غیر ملکی سوداگروں کا ہمارے ملک میں سرمایہ لگانا ہمارے لیے مضر ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر سرمایہ ہمارا اپنا ہوتا تو نفع جو اس سے پیدا ہوتا ہے اور جو موجودہ صورت میں غیر ملکی سوداگروں کے ہاتھوں میں جاتا ہے، ہمارے ملک میں ہی رہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ ان مغربی سوداگروں کے سرمائے کی وساطت سے بالخصوص تیل، غلہ، شکر، کافی اور سونے کی پیدائش کے وسائل پہلے کی نسبت بہت ترقی کر گئے ہیں یا یوں کہو کہ ان لوگوں نے اپنی سرگرمی اور ہمت سے ہماری سرزمین کے مخفی خزائن کے دروازے کھول کر ہمارے لیے آئندہ تجارت کی راہیں کھول دی ہیں۔ بشرطیکہ ہمارے پاس سرمایہ موجود ہو۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ سرمایہ کسی ملک کے وسائل پیدائش کی ترقی، دستکاری اور تجارت کی مختلف شاخوں کے قیام کے لیے کہاں تک ضروری ہے۔ لہٰذا ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں جن سے یہ زیادہ ہو سکتا ہے۔

(۱) یہ بیان ہو چکا ہے سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور سرمایہ دار کی کفایت شعاری پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا تعلیم یا دیگر حالات جو کسی ملک کے لوگوں کو کفائت شعار بنانے کے ممد ہیں، سرمائے کی زیادتی کا پہلا سبب ہیں۔ دولت بچانے کی خواہش لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور شرح سود کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ البتہ جو قومیں سود لینا خلاف مذہب تصور کرتی ہیں، ان پر یہ محرک اثر نہیں کر سکتا۔

(۲) پیداوار دولت کی مقدار کے زیادہ ہونے سے بھی سرمایہ کی مقدار بڑھتی ہے۔ اگر کسی ملک میں چالیس ہزار من غلہ پیدا ہوتا ہے اور اس میں سے دس ہزار من بطور سرمایہ جمع کر لیا جاتا ہے تو ظاہر ہے کہ ساٹھ ہزار من غلہ پیدا ہونے کی صورت میں زیادہ مقدار بطور سرمایہ جمع ہونی ممکن ہو سکے گی۔

(۳) تجارت اور تبادلہ سے بھی سرمائے کی مقدار بڑھتی ہے۔ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں پیداوار دولت کی مقدار بڑھتی ہے جس سے (دیکھو مسئلہ نمبر 2) سرمائے کی مقدار میں زیادتی ہوتی ہے۔

حوالہ جات:۔

(1) زمین افتادہ اور قدرتی دیگر اسباب جبکہ سرمائے اور محنت کی وساطت سے ان کی قابلیت افادت معمول سے زیادہ نہ ہوگئی ہو سرمائے میں داخل نہیں ہیں۔ اس استثناء کی وجہ آگے معلوم ہوگی۔

(2) Competition (مرتب)

(3) Circulating Capital (مرتب)

(4) Fixed Capital (مرتب

(5) Credit (مرتب)

(6) Rights (مرتب)

باب چہارم

کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے

کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے [1] اس قوم کی زمین، محنت اور سرمائے کے حسن استعمال اور ان کے مفید طریقوں میں صرف ہونے پر انحصار رکھتی ہے [2]۔ خواہ زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو، [3] خواہ پہنچ گئی ہو۔ محنتی کی ہنر مندی، ذہانت، فن زراعت کی ترقی، تنظیم محنت، سرمائے کو زیادہ دوراندیشی سے نئی نئی مفید صورتوں میں صرف کرنے اور اسی قسم کے دیگر اسباب سے دولت کی پیداوار انتہا درجے کی ترقی کرتی ہے۔ یہاں ایک بڑا ضروری اور اہم اقتصادی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پیداوار دولت زمین، محنت اور سرمائے کی قوت پیداوار سے متعین ہوتی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ کوئی قوم اس قدر دولت پیدا نہیں کر سکتی جو اس کے وسائل پیدائش کے مطابق ہو؟ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ وسائل پیدائش میں خواہ کسی قدر قوت ہو دولت کی پیداوار اس قوت کے لحاظ سے کم رہتی ہے۔ یعنی اس قدر پیدا نہیں ہوتی جس قدر کہ ہونی چاہیے۔ اس اختلاف کا باعث کیا ہے؟

اس سوال کا جواب علم الاقتصاد کے تمام حصص کے مطالعہ کے بغیر محال ہے۔ دولت کے صرف یا استعمال کے بیان میں تمہیں معلوم ہوگا بعض دفعہ دولت کا استعمال قوم کی قوت سرمایہ اور محنت کو انتہا درجے کا نقصان پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح تقسیم دولت کے بیان میں تم معلوم کرو گے کہ بعض دفعہ دولت اپنے پیدا کنندوں کے درمیان ایسے بے اصول طور پر تقسیم ہوتی ہے کہ بعض افراد کو ایک مستقل نقصان پہنچ جاتا ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس تبادلے کے باب میں اس امر کے اسباب واضح ہوں گے کہ بعض دفعہ پیدائش دولت کیوں رک جاتی ہے یا دستکاری کی چلتی گاڑی میں کیوں روڑا اٹک جاتا ہے۔ جس سے پچھلے سالوں کی پیدا کردہ دولت ان بے کاری کے دنوں میں صرف ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا سوال کا شافی جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک تم علم الاقتصاد کے تمام حصص کا غور سے

مطالعہ نہ کرلو۔ یہاں ہم صرف ان اسباب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو پیدائش دولت کے سدراہ ہیں۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس امر کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قدرتی طور پر زمین کی زرخیزی (بشرطیکہ انسان اپنی عقلمندی کے زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا رہے) دن بدن کمی کی طرف میلان رکھتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱) محنت اور سرمایہ کسی حد تک نا قابل انتقال ہیں۔ تمام مہذب قوموں میں محنت اور سرمایہ دونوں کچھ اس طرح خاص خاص صورتیں اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر ان کو ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل کرنا چاہیں تو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مثلاً جس تاجر نے لاکھوں روپیہ کی رقم کلوں پر صرف کر دی اس کے واسطے یہ امر کس طرح ممکن ہے کہ اپنا کثیر سرمایہ بغیر خرچ اور دیگر نقصان کے کسی اور صورت میں منتقل کر دے یا جس دستکار نے ایک خاص پیشہ بڑی جانفشانی سے[4] اور روپیہ خرچ کر کے سیکھا ہے اس کے واسطے کس طرح ممکن ہے کہ اس پیشے کو چھوڑ کر کسی اور پیشے کو اپنا ذریعہ معاش بنائے؟

(۲) محنت اور سرمائے کا ناعاقبت اندیشی سے استعمال کیا جانا۔ اگر ان ہر دو وسائل کو دور اندیشی سے استعمال نہ کیا جائے تو ان کی قوت پیدائش میں ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کارخانے کے مالک کی وفات پر اس کا جانشین اپنی خامی اور ناتجربہ کاری کے باعث دور اندیشی سے کام نہ لے اور اس طرح اس کی بدانتظامی کی وجہ سے وسائل مذکور کی قوت پیدائش میں ایک معتدبہ کمی پیدا ہو جائے۔ تم کو معلوم ہے کہ موجودہ زمانے میں ضروریات کے تقاضے سے تمام مہذب ملکوں میں محنت اور سرمائے کا انتظام افراد کی ایک خاص جماعت کے ہاتھوں میں ہے۔ جس کو جماعت مالکان یا کارخانہ داران کہتے ہیں۔ اس جماعت کا وجود سرمائے اور محنت کے مفید انتظام کے لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے فوج کے لیے اعلیٰ افسروں کا وجود۔ جس قدر اصول انقسام محنت پر زیادہ عمل ہوتا جاتا ہے اسی قدر مالک یا کارخانہ دار[5] کا وجود نہ صرف تنظیم محنت اور دستکاری کو مفید راہوں میں لگانے کے لیے بلکہ دستکاروں کے درمیان حسن انتظام قائم رکھنے کے لیے زیادہ ضروری ہوتا جاتا ہے۔ مالک کے اس امر کا فیصلہ کون کرسکتا ہے کہ کون سی شے تیار کی جائے گی اور کس قیمت پر فروخت کی جائے گی؟ غرض کہ دنیا کی موجودہ دستکاری اس بات کی طرف میلان رکھتی ہے کہ اس کا انتظام دن بدن ایک خاص جماعت افراد کے ہاتھوں میں آتا جائے[6]۔

بعض ماہرین علم الاقتصاد کی رائے ہے کہ پیدائش دولت کے نظام میں مالک یا کارخانہ دار کا

وجود ضروری نہیں ہے، بلکہ ان حکماء کے خیال میں اس کی موجودگی دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ایک قسم کی بیجا تجارتی رقابت پیدا کر دیتی ہے جس کے نتائج پیدائش دولت کے حق میں مضرت رساں ہوتے ہیں۔ اس دقت کے رفع کرنے کی کئی راہیں بتائی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک ہی پیشے کے دستکار مشترک سرمائے سے مل کر کام کیا کریں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کی باہمی معاونت کئی حیثیتوں سے مفید ہے۔ مثلاً اگر یہ معرض عمل میں آ جائے تو۔

(۱) دولت کی وہ مقدار جو موجودہ اقتصادی حالات میں مالک کی جیب میں جاتی ہے، دستکاروں کے قبضے میں آئے گی۔

(۲) دستکار ہر طرح سے خود مختار ہوگا اور دولت کی جو صورت چاہے گا پیدا کرے گا۔

(۳) موجودہ حالات تمدن میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دستکار مالکوں سے زیادہ اجرت لینے پر ضد کرتے ہیں اور اگر ان کو اجرت کی مطلوبہ مقدار نہ ملے تو کام کاج چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اگر اس طریق کو عمل میں لایا جائے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا کیونکہ جس فریق سے ضد پیدا ہو جانے کا امکان ہے وہ فریق ہی نہ رہے گا۔

(۴) دستکار کو کفایت شعاری کی تحریک ہوگی اور اپنا کام تن دہی سے کرے گا۔

یہ طریق معاونت عملاً دو صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔

(اول) وہ صورت جس میں دستکار متحد ہو کر کسی خاص تجارتی شاخ میں آمدنی پیدا کرنے کی غرض سے کام کریں[7]۔

(دوم) وہ صورت جس میں دستکار اپنی حاصل کردہ دولت باحسن وجوہ صرف کر سکیں۔ مثلاً چند دستکار مل کر کھانے پینے کی چیزوں کی ایک دکان کھولیں اور آپس میں یہ عہد کر لیں کہ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں معمولی منافع پر اسی دکان سے خرید کیا کریں گے اس طریق سے ایک تو یہ فائدہ ہوگا کہ ضرورت کی چیزیں کسی قدر سستی مل جایا کریں گی اور علاوہ اس کے مصارف دکان وغیرہ نکال کر جو سال بھر کے بعد منافع[8] ہوگا وہ سب دستکاروں پر ہر ایک کے حصہ کے مطابق تقسیم ہو جایا کرے گا۔ مقدم الذکر صورت میں کچھ بہت بڑی کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی کیونکہ دستکار متحد ہو کر وہ تجارتی قابلیت نہیں دکھاتے جو کارخانہ داروں میں بالخصوص پائی جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر صرف کل کی طرح کام کرنا جانتے ہیں اور اس تجارتی مذاق سے قطعاً معرا ہوتے ہیں، جس کے ذریعے سے کارخانہ دار تجارت کے

جذرومد کو ایک نگاہ سے معلوم کر لیتے ہیں۔ البتہ موخر الذکر میں کامیابی کی امید ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں جہاں اس قسم کے اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔

(سوم) اس مختصر سی گریز کے بعد جاننا چاہیے کہ پیدائش دولت کا تیسرا مانع بعض قدرتی حوادث سے دولت کا برباد ہو جانا ہے۔ مثلاً آندھی کے طوفان سے جہازوں کی تباہی، آتش زدگی اور ریل کے دیگر حادثات وغیرہ۔

اس باب کے ضمن میں ایک اور ضروری مسئلے کی تحقیق بھی لازم ہے۔ تم جانتے ہو کہ مختلف ممالک میں پیداوار دولت کی مقدار مختلف ہوتی ہے بلکہ اگر ایک ہی ملک کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ مختلف زمانوں میں اس ملک کی پیداوار دولت کی مقدار مختلف رہی ہے۔ بسا اوقات دو ملک تہذیب وتمدن کے ایک ہی درجے پر ہوتے ہیں اور ان کے دیگر حالات بھی قریباً قریباً یکساں ہوتے ہیں۔ تاہم مذکورہ بالا اختلاف اس صورت میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اس واقعہ پر غور کرنے سے دو ضروری سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) وہ کون سے اسباب ہیں جن سے یہ اختلاف پیدا ہوتا ہے؟

(۲) یہ اسباب کون سے اقتصادی قوانین کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں؟

پیدائش دولت ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے بالعموم تین مدارج ہو سکتے ہیں:-

(ا) وہ محنت جو کسی مادی شے پر قبضہ حاصل کرنے میں عارض ہوتی ہے۔ مثلاً جنگل سے درختوں کا کاٹنا۔

(ب) وہ محنت جو اس قدرتی شے میں ایسے تغیرات پیدا کرنے پر صرف ہوتی ہے جو اس کو انسانی استعمال کے قابل کر دیتے ہیں۔ مثلاً لکڑی کی چوکیاں تیار کرنا۔

(ج) وہ محنت جو مصنوعات کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے میں صرف ہوتی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں محنت نسبتاً زیادہ مساعد حالات میں صرف کی جائے گی یا جہاں محنتیوں کی تعداد یا ان کی محنت کی کارکردگی زیادہ ہوگی وہاں پیدائش دولت کا عمل نہایت نتیجہ خیز ہوگا۔ مختلف ممالک کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) بعض ممالک میں محنت کے واسطے حالات نسبتاً زیادہ مساعد ہوتے ہیں۔ مثلاً کہیں قدرت نے اپنی فیاضی سے کوئلے کی وسیع کانیں رکھ دی ہیں اور کہیں مفید دھاتوں کے بیش بہا

خزانے زمین کے اندر پوشیدہ کر دیے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض ممالک میں کئی اشیاء قدرتی طور پر[9] پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ دیگر ممالک انہیں اشیاء کو محنت شاقہ سے حاصل کرتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے فوائد ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ مغلوں کے زمانے میں دریاؤں کا ایک فائدہ اور فائدوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مختلف شہروں اور قصبوں میں تجارتی اور دیگر تعلقات کا سلسلہ انہیں کی وساطت سے جاری تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ سب کام ریل گاڑی کی وساطت سے سرانجام پاتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قدرت کے مختصر خزائن سے ہم صرف اسی صورت میں مستفید ہو سکتے ہیں جبکہ ہم کو ان کا علم ہو۔ تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشیاء مادیہ کے مخفی خواص اور زمین کے پوشیدہ اسرار روز بروز زیادہ معلوم ہوتے جاتے ہیں اور انسان ان سے مستفید ہو کر بے انتہا فائدہ اٹھاتا جاتا ہے۔ جن قوموں کو یہ علم نہیں، ضرور ہے کہ وہ پیدائش دولت میں ان اقوام سے پیچھے ہوں جن کو ان اسرار کا علم ہے۔ معدنیات کو ہی لو جس ملک کے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ معدنیات کس طرح دریافت ہوا کرتی ہیں ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا، خواہ ان کے ملک کی زمین قیمتی دھاتوں کے خزانوں سے معمور ہو۔

(۲) بعض ممالک میں دستکاروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو پیدائش دولت پر ایک نمایاں اثر ڈالتی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں دستکاروں کی تعداد کثیر ہے۔ صرف سرمائے کی کسر ہے۔ ورنہ پیدائش دولت میں ہم اور قوموں سے اس قدر پیچھے نہ ہوتے۔ کمیت کے علاوہ مختلف ممالک کے دستکاروں کی محنت کی کیفیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ بعض ممالک کے دستکاروں کی عادات جبلی طور پر قوانین صحت کے خلاف ہوتی ہیں۔ کہیں پانی اور صاف ہوا دستیاب نہیں ہو سکتی۔ کہیں اور اس قسم کے طبعی اسباب ہوتے ہیں جن سے دستکاری کی کیفیت پر اثر پڑتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جسمانی قوت کے اختلاف کے علاوہ مختلف مقامات کے دستکاروں کی ہنرمندی، سمجھ اور دوراندیشی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض اقوام قدرتاً دیگر اقوام کی نسبت زیادہ ذکی اور چست ہوتی ہیں۔ بعض قدرتاً سست اور آرام طلب۔ اس قسم کے نقائص کا دور کرنا ملک کے مصلحوں اور معلموں کا فرض ہے۔

(۳) محنت کے محرکات میں بھی بالعموم اختلاف ہوتا ہے۔ فطرتاً ہر انسان دولت کا خواہشمند ہے اور

یہ فطری خواہش محنت کا سب سے بڑا محرک ہے، لیکن بعض اوقات دیگر محرکات زیادہ زبردست ثابت ہوتے ہیں اور دولت کی خواہش کو انسان کی زندگی پر پورا پورا اثر کرنے سے روکتے ہیں۔ بعض مذاہب میں دولت کی تحقیر ایک مسلم اصول ہے، جو ضرور ہے کہ ان مذاہب کے مخلص پیروؤں پر اپنا اثر کرے۔ بالعموم مشرقی اقوام کے لوگ تقدیر کے اس قدر قائل ہیں کہ کل کی فکر کرنا جانتے ہی نہیں اور توکل کے بھروسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ دولت کی خواہش ایک خاص حد تک ہی محرک محنت ہو سکتی ہے، کیونکہ محنت سے اصل مدعا یہی ہوتا ہے کہ تمام ضروریات پوری ہو جائیں۔ جب تمام ضروریات پوری ہو گئیں تو پھر یہ محرک اپنا عمل نہیں کر سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان کی ضروری حاجات پوری ہو جاتی ہیں تو قدرتاً جدید ضروریات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مکان کو آراستہ کرنے اور دیگر آسائش کے سامان کی خواہش۔ علم و ادب اور دیگر علمی مشاغل سے لذت اٹھانے کی خواہش بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔ یہ محرکات ثانی ہیں، جو مختلف اقوام کی حالت میں اور تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج میں مختلف طور پر اپنا اثر کرتے ہیں۔ اسی طرح[10] ذاتی ضروریات کے پورا ہونے پر قدرتاً ہر انسان کو اولاد کے لیے کچھ نہ کچھ پیچھے چھوڑ جانے کا بھی خیال پیدا ہوتا ہے جو محنت کا ایک مزید محرک ہے۔

(۴) مختلف ممالک کے دستکاروں کے اخلاقی حالات مختلف ہوتے ہیں۔ دستکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دیانت دار ہو، کام چور نہ ہو اور اپنی طبیعت کے غیر نافع جذبات پر قدرت رکھتا ہو۔ جس قدر عاقبت اندیشی اور دیانت داری اس میں ہو گی جس قدر اپنے مقررہ فرض کی انجام دہی کا خیال اس میں ہو گا، اسی قدر اس کی محنت قومی دولت کو زیادہ کرے گی۔ سست اور آرام طلب دستکار اپنے ملک اور قوم کے لیے ایک مضرت رساں وجود ہے کیونکہ اس کا وجود قوم کی دولت کو دن بدن گھٹاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا سب سے ضروری فرض یہی ہے کہ عوام میں دیانت داری، چستی، عاقبت اندیشی اور دیگر ضروری اوصاف پیدا ہوں اور ان کے دلوں پر یہ بات نقش ہو جائے کہ تمام قوم کا فائدہ بحیثیت مجموعی اور کسی خاص فرد، قوم کا فائدہ متغائر چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور جو دستکار اپنے حیوانی جذبات کی پیروی کر کے اپنے جسمانی اور روحانی قویٰ کو نقصان پہنچاتا ہے وہ نہ صرف

اپنی ذات پر بلکہ اپنے ملک اور قوم پر بھی ظلم کرتا ہے۔

(۵) مختلف ممالک میں دستکاروں کی محنت کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے اور اکثر ممالک میں اس کارکردگی کو زیادہ کرنے اور سرمائے کے زیادہ دور اندیشی سے استعمال کیے جانے کے وسائل اختیار کیے گئے ہیں۔ کہیں طریق اشتراک مروج ہے، کہیں طریق معاونت (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) سے کام لیا جاتا ہے اور کہیں دیگر اقسام کے تجارتی اتحاد پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بھی طریق اشتراک یعنی مشترک سرمائے سے کام کرنا اب مروج ہوتا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریق ان ممالک کے لیے نہایت مفید ہے جہاں مجموعی طور پر سرمائے کی مقدار کم ہو۔ اگر کوئی شخص سو روپیہ سرمائے کے ساتھ کوئی تجارت شروع کرے تو اس کو کچھ منافع کی توقع نہ ہوگی، لیکن اگر سو سو روپیہ سرمائے والے بیس آدمی مل کر کام شروع کریں تو بہت زیادہ منافع کی امید ہوگی۔ یہ اسباب اختلاف مختلف ممالک میں حقیقتاً موجود تو ہیں لیکن ان کا اثر دیگر اسباب کے عمل سے زائل ہو رہا ہے۔

ہم نے اپنے پہلے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ اب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مندرجہ بالا اسباب اختلاف کون سے اقتصادی قوانین کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اسباب میں سے بعض مثلاً سبب نمبر ا کا عمل کسی قانون کلیہ کے تابع نہیں ہے۔ تاہم بعض کا عمل قوانین کے تابع ہے۔ مثلاً دستکاروں کی تعداد اور اس کے متعلقہ اسباب کا عمل قانون کلیہ آبادی کی تحت میں ہے اور علیٰ ہذا القیاس صنعت کی کارکردگی وغیرہ کا عمل قانون سرمایہ کے احاطۂ اثر میں داخل ہے۔ ماہرین علم الاقتصاد نے اس بارے میں تین کلیہ قوانین دریافت کیے ہیں جن کو ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں۔

قانون آبادی

(۱) اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کے افراد کے زیادہ ہونے سے اس قوم کے دستکاروں کی تعداد بڑھتی ہے مگر اس وقت یہ امر محل بحث نہیں ہے۔ ہم قانون آبادی پر اس تعلق کے لحاظ سے نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں جو افزائش افراد اور پیداوار دولت کے درمیان ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ یہ قانون تین قضایا پر منقسم ہو سکتا ہے۔

اول یہ کہ آبادی ہمیشہ بڑھنے کا میلان رکھتی ہے اور اس کی افزائش اس امر کا خیال نہیں کرتی کہ آیا مزید آبادی کے گزارے کے لیے کافی سامان معیشت موجود ہوگا یا نہیں۔ بعض حکماء نے تخمینہ لگایا ہے کہ بڑے بڑے قحط اور وبائیں نہ آئیں تو آبادی تیس سال میں دوگنی ہو جائے گی۔

دوم اگر زمین کے کسی قطعہ میں آبادی اس طرح دوگنی تگنی ہوتی جائے اور دیگر اسباب اس کی افزائش کی سد راہ نہ ہوں (مثلاً وبا، قحط، جنگ اور شادیوں کی کمی وغیرہ) تو ایک خاص میعاد کے بعد قطعہ مذکور کی پیداوار وہاں کے آدمیوں کے لیے مشکل سے کافی ہوگی، اور بالآخر مطلق کفایت نہ کرے گی۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ آبادی کی مفروضہ افزائش کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکے گا۔

سوم ہمارا گزشتہ تجربہ۔ جو ہم کو صنعت وحرفت کی ترقی کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوا ہے، اس امر کی تصدیق نہیں کر سکتا کہ فن زراعت کی آئندہ ترقی سے ہم اپنی آبادی کی مفروضہ افزائش کے مطابق خوراک کی زیادہ مقدار پیدا کر سکیں گے۔

قضیہ نمبر ۲۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون تقلیل حاصل بھی جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں قانون آبادی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے اور ان دونوں کے اجتماع سے یہ نتیجہ قائم ہوتا ہے کہ آبادی کے ایک خاص حد تک بڑھ جانے کے بعد زرعی دستکاروں کی مزید آبادی سے محنت کی قابلیت پیداوار کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس قدر آبادی زیادہ ہوگی اور ایک حد معین سے بڑھتی جائے گی (یہ حد معین مختلف ممالک کی صورت میں مختلف ہوسکتی ہے کیونکہ مختلف اقوام وممالک میں صنعت وحرفت وفن زراعت اور دیگر ایجادات کی ترقی کے مدارج مختلف ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ ایک چھوٹا سا ملک اپنے ایجادات زرعی کے بل پر ۲۰ کروڑ آبادی کا متحمل ہو سکے اور ایک اور ملک جو اس سے وسعت میں بہت زیادہ ہو لیکن ایجادات میں کم ہو اس سے آدھی آبادی کا بھی متحمل نہ ہو سکے) اسی قدر زمین مزروعہ کی کاشت نقطہ تقلیل تک جلد پہنچے گی۔ جس کا نتیجہ جو کچھ پیداوار دولت پر ہوگا ظاہر ہے۔

محنت کی کارکردگی

(۲) محنت کی کارکردگی کے اختلافات اور ان کے اثر کے متعلق، کوئی کلیہ قانون وضع نہیں ہو سکتا کیونکہ دستکاروں کے طبعی، عقلی اور اخلاقی اوصاف کے فرق بیان کرنے اور ان کے محرکات محنت کی تشریح کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم کو تہذیب وتمدن کے خفی در خفی اسباب کا

پورا پورا علم ہو، جو موجودہ صورت میں ناممکن ہے۔ لہٰذا ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف ممالک کے درمیان مختلف افراد کے ذاتی سرمائے کی افزائش جس پر پیداوار دولت کا ایک حد تک انحصار ہے' کس قانون کی تحت میں ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ قانون افزائش سرمایہ شخصی کیا ہے؟ اس امر کے متعلق محقق مل[11] ایک قانون وضع کرتا ہے کہ سرمایہ جمع کرنے کی خواہش شرح سود کے ساتھ نسبت مستقیم رکھتی ہے۔ جس ملک میں شرح سود زیادہ ہوگی وہاں کے لوگوں کو روپیہ جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہوگی اور جہاں شرح سود کم ہوگی وہاں جمع کی تحریک مطلق نہ ہوگی یا نہایت کم ہوگی۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مل کا یہ قانون کامل طور پر صحیح نہیں ہے کیونکہ جمع کرنے کی تحریک صرف شرح سود کی مقدار سے ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے اور بھی کئی ایک اسباب ہیں بلکہ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ شرح سود کے کم ہو جانے سے جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہو جاتی ہے کیونکہ شرح مذکور کی کمی کی صورت میں ضروری ہے کہ زیادہ رقم بطور سود لینے کی غرض سے زیادہ سرمایہ دیا جائے جس کا پہلے جمع ہونا لازم ہے۔

(۳) قانون سرمایہ شخصی تو کسی قدر وضاحت سے بیان ہو سکتا ہے لیکن قانون سرمایہ قومی (سرمایہ قومی سے مراد پیدائش دولت کے وہ وسائل ہیں جو کسی قوم کی گزشتہ محنت سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً پرانے تعمیر شدہ مکانات، سڑکیں، وغیرہ) کا وضاحت کے ساتھ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی فرد واحد کی نسبت تو ہم کسی قدر رائے لگا سکتے ہیں کہ اس کا سرمایہ کس اصول کے مطابق کم و بیش ہوتا ہے مگر کسی قوم کے سرمائے کی نسبت بحیثیت مجموعی اس قسم کا قانون وضع کرنا نہایت دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ قومی کی زیادتی سے محنت کی مانگ یا یوں کہو کہ اجرت کی مقدار بڑھتی ہے اور اس طرح مختلف ممالک کی پیداوار دولت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ سرمایہ مذکور کا اصل اصول کیا ہے۔ اگر کسی طرح سے کوئی اصول معلوم بھی ہو جائے تو اس سے صحیح نتائج مستخرج نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بسا اوقات اور بالخصوص زمانہ حال میں اکثر قومیں اتنا سرمایہ خود نہیں استعمال کرتیں بلکہ دیگر اقوام کو مستعار دے دیتی ہیں۔ اگرچہ سرمائے کو اس طرح پر مستعار دے دینے سے ان اقوام کو دنیا کی پیداوار محنت میں زیادہ حصہ ملتا ہے، لیکن اس سے ان قوموں کی ذاتی محنت کی قابلیت

پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ان کی خارجی تجارت کے فوائد میں کسی قدر زیادتی ضرور ہو جاتی ہے۔ مزید برآں اکثر اوقات بعض ممالک کے ارکان سلطنت جنگ وغیرہ کے اغراض کے لیے قوم سے قرض لیتے ہیں، جس سے قومی سرمائے میں کمی عارض ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس رفاہ عامہ مثلاً تعلیم وحفظان صحت وغیرہ کے کاموں پر جو محنت صرف ہوتی ہے اس سے کسی فرد کو کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ ان کا فائدہ عام بلا خصوصیت ہوتا ہے۔ نیز وہ محنت جو اکثر افراد حب وطن کے خیال سے نظام سلطنت کی حفاظت اور اس کی اندرونی قوت کو برقرار رکھنے کے لیے کرتے ہیں اکثر مالی فائدہ کی آمیزش سے معرا ہوتی ہے۔ غرض کہ ان وجوہ سے کسی ملک کے سرمایہ قومی کی کمی بیشی کا کوئی وسیع اور کامل اصول قائم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

حوالہ جات:۔

(1) جدید اہل قلم اس باب کو "تنظیم" کے عنوان سے مرتب کرتے ہیں اور تنظیم کو چوتھا عامل پیداوار متصور کرتے ہیں۔(مرتب)

(2) اس جملہ میں الفاظ کی ترتیب میں ادنیٰ تغیر کیا گیا ہے۔(مرتب)

(3) ایضاً۔

(4) یہاں کلمہ "سے" کا اضافہ کیا گیا ہے۔(مرتب)

(5) یہاں اصل میں "کارخاندار" تھا(مرتب)

(6) معاشیات کی اصطلاح میں انہی لوگوں کو منتظم یا کارجو Entrepreneur کہتے ہیں۔(مرتب)

(7) یہ وہی چیز ہے جسے فرانس کے مفکرین نے Syndicalism اور انگلستان کے اصحاب قلم اور خصوصیت سے پروفیسر جی۔ڈی۔ایچ۔ کول نے صنعتی جمہوریت Industrial Democracy کے نام سے موسوم کیا ہے۔ (مرتب)

(8) انجمن ہائے امداد باہمی (Co-operative Societies) اس کی مثال ہیں۔(مرتب)

(9) یہاں الفاظ "طور پر" کا اضافہ کیا گیا ہے۔(مرتب)

(10) جملہ کو مربوط اور مکمل کرنے کے لیے یہاں "اسی طرح" کا اضافہ کیا گیا ہے۔(مرتب)

(11) J.S. Mill (مرتب)

حصہ سوئم

تبادلۂ دولت

- ☆ مسئلۂ قدر
- ☆ تجارت بین الاقوام
- ☆ زر نقد کی ماہیت اور اس کی قدر
- ☆ حق الضرب
- ☆ زر کاغذی
- ☆ اعتبار اور اس کی ماہیت

باب اول

مسئلہ قدر

بعض مصنفین کہتے ہیں کہ تبادلہ دولت علم الاقتصاد کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ مگر یہ رائے تجارت اور تبادلے میں امتیاز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے منطقی وضاحت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس مضمون کو علم الاقتصاد کا ایک علیحدہ حصہ سمجھا جائے تا کہ مختلف اقتصادی مسائل آپس میں مخلوط نہ ہو جائیں۔ اس حصے کا مقصد تناسب تبادلہ یا ان شرائط پر بحث کرنا ہے جن کی رو سے اشیاء کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے جو ایک معین قدر رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب دو چیزوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے تو ایک شے کی ایک خاص معین مقدار دوسری شے کی ایک خاص معین مقدار کے عوض میں دی جاتی ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقدار معین کیوں ہوتی ہے۔ کم و بیش کیوں نہیں ہوتی؟ علم الاقتصاد کے اس حصے کا مقصد اسی سوال کا جواب دینا ہے۔

تبادلہ انقسام محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی ضروریات کی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف ہوتا تو تبادلے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔ لیکن جب ان کے مشاغل میں اختلاف پیدا ہوتا ہے، یا یوں کہو کہ مختلف انسان یا اقوام دولت کی مختلف صورتوں کے پیدا کرنے میں مصروف ہوتی ہیں، تو تبادلے کا دستور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہو کہ تبادلہ اتحاد کی ایک صورت ہے جو اختلاف مشاغل سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک شخص غلہ پیدا کرتا ہے، دوسرا مکئی یا آلو اور تیسرا کپڑا تیار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ضرورت ان سب کو باہمی تبادلے پر مجبور کرے گی۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ غلہ کی کس قدر مقدار دس گز کپڑے یا دو من آلو کے عوض میں دی جائے گی؟ جس قدر اصول انقسام محنت کا عمل وسیع ہوتا جائے گا اسی قدر تبادلے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جائے گا، لیکن چونکہ ایسی صورت میں افراد کو اپنی اپنی ضرورت کی اشیاء کا باہمی تبادلہ کرنے میں دقت ہوگی یا کم از کم ان کے وقت کا کچھ حصہ

اس تبادلے میں ضائع ہوگا اس واسطے قدرتاً تبادلے کا کام افراد کی ایک خاص جماعت کے زیر اہتمام آتا جائے گا۔ جس کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں اقرار تبادلہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کی وساطت سے تجارت کی گاڑی چلتی ہے اور دور دراز ممالک کے باشندوں کے درمیان رابطہ اتحاد پیدا ہوتا ہے اور تبادلہ اشیاء کے ساتھ تبادلہ خیالات بھی ہوتا رہتا ہے۔

غرض ہمارا مقصد اس حصے میں یہ معلوم کرنا ہے کہ تبادلے میں اشیاء کی خاص خاص مقادیر کن اصولوں کے لحاظ سے متعین ہوتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی غلے کی ایک خاص مقدار کے عوض میں چینی چائے کی ایک خاص مقدار یا جاپانی چھاتوں کی ایک خاص تعداد دی جائے؟ یہ مقدار یا یہ تعداد کم و بیش کیوں نہ ہو؟ مختصراً اشیاء میں قوت تبادلہ کن کن شرائط سے پیدا ہوتی ہے؟ اور اس کے اسباب و وجوہ کیا کیا ہیں؟

قدر کی تعریف اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھی جا چکی ہے[1] یعنی قدر قوت تبادلہ کا نام ہے۔ یا اس قدر و قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اس شے کے قابض کو حاصل ہوتی ہے اور جس کو تبادلے میں دے کر وہ شخص بلا لحاظ جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی اوروں کی پیداوار محنت کو حاصل کر سکتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کیوں ایک شے اپنے قابض کو یہ قدرت یا قوت دیتی ہے اور دوسری نہیں دیتی؟ کیوں ایک شے کے قبضے سے اوروں کی پیداوار محنت پر ہفتوں مہینوں بلکہ سالوں تک یہ قدرت حاصل رہتی ہے اور دوسری شے کے قبضے سے یہ قدرت مطلق حاصل نہیں ہوتی یا اگر ہوتی ہے تو نہایت قلیل عرصے کے لیے؟ یہ سوال علم الاقتصاد کے نہایت ضروری سوالوں میں سے ہے۔ لہٰذا طالب علم کا فرض ہے کہ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے اس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لے۔

ظاہر ہے کہ تبادلے کے لیے کم از کم دو اشیاء کا ہونا لازم ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی شے کا تبادلہ ہو سکتا ہے تو ہمارا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کا تبادلہ کسی اور شے کے ساتھ ہو سکتا ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شے کی قدر تبادلے میں اتنی ہے، تو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہم کسی اور شے یا اشیاء کی قدر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جن کے عوض میں شے مذکور دی جا سکتی ہے۔ عام طور پر یہ دوسری شے جس کے عوض میں کوئی شے دی جا سکے زر نقد ہے، جس کو دنیا کی مہذب اقوام نے اشیاء کی قدر کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ پس کسی شے کی قدر سے حقیقت میں مراد اس کی قیمت سے یا زر نقد کی اس مقدار سے ہے جو اس شے کے عوض میں دی جائے۔ اس مقام پر قدر اور قیمت کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے، لہٰذا ہم

اسے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس چار من غلہ ہے جس کے عوض میں اسے ۲۷ من کوئلہ مل سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ چار من غلے کی قدر ۲۷ من کوئلے کی قدر کے برابر ہے۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کے مفہوم میں اشیاء کا مقابلہ داخل ہے اور قدر ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ایک شے کی قدر دو طرح سے کم و بیش ہو سکتی ہے یا تو اس کی ذاتی قدر میں کمی بیشی ہونے سے، یا دیگر اشیاء کی قدر میں تغیر پیدا ہو جانے سے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں نہیں بڑھ سکتی کیونکہ ایک شخص کی قدر کی زیادتی اور دوسرے کی قدر کی کمی لازم و ملزوم ہیں۔ یہ کہنا کہ ایک ہی وقت میں اشیاء کی قدر کم و بیش ہو سکتی ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہہ دے کہ چھ اشخاص [2] میں سے ہر ایک اپنے باقی پانچ ہمراہیوں کی نسبت زیادہ تیز رفتار ہے۔ الغرض کسی شے کی قیمت اس کی قدر کی ایک خاص صورت کا نام ہے، جب کسی شے کی قدر کا تخمینہ ان قیمتی دھاتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے سے کیا جائے جو شائستہ اقوام میں بطور معیار قدر مستعمل ہوں، تو کہا جاتا ہے کہ اس شے کی قیمت معلوم ہو گئی ہے گو تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں کم و بیش نہیں ہو سکتی تاہم نہ ان کی قیمت کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے۔

مندرجہ ذیل توضیح سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسئلہ قدر حقیقت میں ان اسباب کا دریافت کرنا ہے جن پر اشیاء کی قدر ایک معین معیار کے لحاظ سے منحصر ہوتی ہے۔ ان معنوں میں کوئی شے قدر نہیں رکھ سکتی جب تک اس میں دو خواص نہ ہوں۔ اول افادت [3] دوئم دقتِ حصول [4]۔ افادت سے مراد یہ ہے کہ اس شے میں کسی انسانی ضرورت یا خواہش کو پورا کر سکنے کی خاصیت موجود ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا امتحان ہے کہ جب تک کوئی شے پہلے اس امتحان میں کامیاب نہ ہو لے قدر رکھنے والی اشیاء کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتی، لیکن اس فہرست میں کوئی خاص درجہ یا مقام حاصل کرنا اس شے کی دقت حصول پر موقوف ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جس قدر کسی شے میں انسانی ضروریات کو پورا کر سکنے کی خاصیت ہو گی اسی قدر اس شے کی قدر بھی زیادہ ہو گی۔ اسی افادت کی کمی بیشی کی وجہ سے اشیاء کی طلب یعنی مانگ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ جس قدر کسی شے میں افادت زیادہ ہو گی اسی قدر اس کی مانگ بھی زیادہ ہو گی اور جس قدر افادت کم ہو گی اسی قدر اس کی مانگ بھی کم ہو گی۔ خریدار ان اشیاء کا معاوضہ زیادہ دیں گے جن کی ان کو ضرورت ہے مگر جن اشیاء کی ان کو ضرورت نہیں ہے ان کا معاوضہ اول تو دیں گے ہی نہیں یا اگر دیں گے تو بہت کم دینے پر راضی ہوں گے۔ بعض محققین علم الاقتصاد نے

انسانی فطرت کے اس میلان کو ظاہر کرنے کے لیے اصطلاح افادت انتہائی [5] استعمال کی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اصطلاح مذکور نہایت مفید ہے کیونکہ اس کے استعمال سے تبادلے کی تحریک اور اس کے فوائد کی توضیح ہوتی ہے اس کا مفہوم واضح کرنے کی غرض سے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ آٹے کا ایک سیر ایک آدمی کی بقائے حیات کے لیے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ایک سیر میں زیادہ افادت ہو گی لیکن اس شخص کے نزدیک آٹے کے دوسرے اور تیسرے سیر میں وہ افادت نہ ہو گی جو پہلے سیر میں تھی کیونکہ وہ مقدار اس کے بقائے حیات کے لیے لازم تھی۔ اس مثال میں مقدار تو وہی ایک سیر ہے لیکن ہر سیر کی افادت آٹے کو استعمال کرنے والے کے لحاظ سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شخص آٹے کے تیسرے سیر کو اس قیمت پر خریدنا پسند نہیں کرے گا جس قیمت پر کہ اس نے پہلے سیر کو خریدا تھا۔ پس کسی کی افادت انتہائی سے مراد اس شے کی آخری یا اختتامی حصے کی افادت ہے، جس کو مشتری قیمت کی اس کم سے کم مقدار کے عوض میں خرید کرتا ہے، جو اس شے کا بائع منظور کر سکتا ہے۔ مثال بالا میں آٹے کے تیسرے سیر یعنی اختتامی یا انتہائی حصے کی قیمت اس کی افادت سے متعین ہو گی۔ چونکہ مثال مذکور میں خریدار کو آٹے کے تیسرے سیر کی ضرورت نہیں ہے۔ اس واسطے اول تو وہ خریدے گا ہی نہیں اور اگر خریدے گا بھی تو اس بات پر مصر ہو گا کہ قیمت کی کم سے کم مقدار ادا کرے۔ آخر کار قیمت کی اس کمتر مقدار پر سودا ہو گا جس کو بائع شے منظور کر سکتا ہے۔ اس توضیح سے ظاہر ہے کہ خریداروں کے لحاظ سے اشیاء کی معمولی قیمت ان کی افادت انتہائی سے متعین ہوتی ہے۔ بعض محققین کے نزدیک یہی افادت قدر اشیاء کا اصل اصول ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر شے کی قدر اس شے کی افادت پر منحصر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس شے میں قدر ہو گی اس میں افادت بھی ضرور ہو گی لیکن برعکس صحیح نہیں۔ یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر مفید شے کوئی خاص قدر بھی رکھتی ہو۔ ہوا، پانی وغیرہ مفید اشیاء ہیں مگر ان کی قدر کچھ نہیں ہے کیونکہ قدرت خود بخود بغیر انسانی کوشش کے اس کو کثرت سے مہیا کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی شے بعض اشخاص کے لیے مفید ہوتی ہے اور بعض کے لیے کچھ فائدہ نہیں رکھتی۔ علیٰ ہذا القیاس بعض اشیاء خاص خاص مقامات میں افادت رکھتی ہیں، بعض میں نہیں۔ مزید برآں بعض اشیاء میں مطلق افادت نہیں ہوتی لیکن ان کی قدر بڑی ہوتی ہے مثلاً ہیرے، جواہرات وغیرہ۔ غرض کہ افادت قدر کا ماخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ اس کے لیے ہمیں کوئی اور کلیہ اصول معلوم کرنا چاہیے۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ افادت کے علاوہ قدر کے لیے دقّت حصول بھی ضروری ہے۔ یعنی ان کے نزدیک کسی[6] شے کا مفید ہونا اور نیز مشکل سے ہاتھ آنا اس[7] کی قدر کا باعث ہوتا ہے۔ اس رائے کو صحیح تسلم کرنے والے دقّت حصول کی تین صورتیں بیان کرتے ہیں۔

(ا) اول یہ کہ اشیاء کی رسد محدود ہو۔ مثلاً گزشتہ مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں یا دیگر کمیاب چیزیں۔ کیا اس صورت میں اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہوگی جو ابتداً ان پر صرف ہوئی تھی؟ نہیں۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان بالعموم اپنی محنت ایسی اشیاء کے معاوضے میں نہیں دیتا جن پر کچھ محنت نہ صرف ہوئی ہو اور نیز بالآخر مجموعی طور پر اشیاء کی قدر قریباً قریباً اس محنت کے مطابق ہوگی جو ان پر ابتداً صرف ہوئی تھی۔ تاہم حق یہ ہے کہ کسی شے کی قدر اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ اس شے کی تیاری میں ابتداً کتنی محنت صرف ہوئی تھی بلکہ یہ اس امر پر منحصر ہے کہ وہ شے اب بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شاہ نامہ فردوسی کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا مل جائے تو اس کی قدر اس محنت کا نتیجہ نہ تصور کرنی چاہیے جو ابتداً اس کی تحریر میں صرف ہوئی تھی بلکہ اس کا انحصار اس امر پر ہوگا کہ اکثر لوگوں کو اس نسخہ کی ضرورت ہے اور اب ایسا تیار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ابتدائی محنت بھی کسی شے کی قدر کا ملخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ مندرجہ بالا دلیل کے علاوہ اس دعویٰ کے[8] ثبوت میں ذیل کے دلائل بھی دیئے جا سکتے ہیں:-

(ا) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے، تو قدر کی کمی بیشی محنت کی کمی بیشی پر منحصر سمجھنی چاہیے مگر یہ بات صریحاً تجربے کے خلاف ہے۔ جس وسیع زمین پر لاہور جیسا عظیم الشان شہر آباد ہے، اس کی قدر اندازے سے زیادہ ہے، لیکن یہ زمین کسی طرح محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔

(ب) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے تو جن دو چیزوں پر مساوی محنت صرف ہوئی ہے، ان کی قدر بھی مساوی ہونی چاہیے مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ اگر ایک ٹکڑا سونے اور ایک ٹکڑا لوہے کا دونوں مساوی محنت سے حاصل ہوں، تو کیا ان کی قدر بھی مساوی ہوگی؟ ہرگز نہیں۔

(ج) اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے، تو ہر شے کی قدر اس محنت سے متناسب ہوگی جو اس شے کے حاصل کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کو خوش قسمتی سے زمین کی سطح پر پڑا ہوا سونے کا ایک ٹکڑا مل جاتا ہے۔ ایک اور شخص کو ویسا ہی ٹکڑا ہفتہ بھر زمین کھود کھود کر

ملتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک اور شخص ہے، جس کو اس قسم کا ٹکڑا مہینے کی محنت کے بعد ملتا ہے۔ اس اصول کی رو سے چاہیے کہ جس شخص کو ایک مہینے کی محنت کے بعد سونے کا ٹکڑا ملا ہے اس کا سونا اس شخص کے سونے سے بہت زیادہ بیش قیمت ہو جس کو بغیر محنت کے زمین پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔

(د) اگر محنت کو قدر کا باعث سمجھا جائے تو جس شے پر محنت صرف کی گئی ہے چاہیے کہ اس کی قدر دوامی اور مساوی ہو مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی شے کی قدر مختلف مقامات میں مختلف ہوتی ہے بلکہ بعض جگہ کئی اشیاء کی قدر کچھ بھی نہیں ہوتی، حالانکہ ان پر محنت بھی صرف کی گئی ہو۔ افریقہ کے وحشیوں کے درمیان ایک سنسکرت پڑھانے والے پنڈت یا عربی کے تعلیم دینے والے مولوی کا علم کیا قدر رکھ سکتا ہے؟ اگر ہندوستان کے مسلمان ترکی ٹوپیاں پہننا یک قلم ترک کر دیں تو اس اصول کی رو سے ضرور ہے کہ ان کی قدر بدستور قائم رہے اگرچہ ان کی مانگ مطلق نہ ہو۔

(ر) اگر محنت کو قدر کا ماخذ سمجھا جائے تو محنت کی قدر کا کیا ماخذ ہوگا؟

(۲) دوسری صورت وقت حصول کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی شے کی تیاری میں محنت اور سرمائے کی ضرورت ہو۔ اس ضمن میں جو اشیاء داخل ہیں ان کی قدر یا قیمت ان اشیاء کے مصارف پیدائش سے متعین ہوگی۔ یہ غلطی بھی اس غلطی کا ایک نتیجہ ہے کہ اشیاء کی قدر کا ماخذ محنت ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے قدر کا انحصار ابتدائی محنت پر نہیں ہوتا، بلکہ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ موجودہ حالت میں وہ شے بغیر محنت اور سرمائے کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بعض کوئلے کی کانوں میں اوپر کی تہوں کا کوئلہ نہایت عمدہ ہوتا ہے اور نیچے کی تہوں کا کوئلہ اچھا نہیں ہوتا بلکہ اس میں مٹی اور راکھ وغیرہ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کا کوئلہ نکالنے میں مصارف کی مقدار کم ہوگی اور نیچے کا کوئلہ نکالنے میں چونکہ محنت زیادہ صرف ہوئی ہے اس واسطے مصارف کی مقدار بھی زیادہ ہوگی، لیکن اگر اشیاء کی قدر مصارف پیدائش پر منحصر ہے تو چاہیے کہ نیچے کے کوئلے کی قیمت اوپر کے کوئلے کی قیمت سے بہت زیادہ ہو۔

(۳) تیسری صورت وقت حصول کی یہ ہے کہ بعض اشیاء اس قسم کی ہوتی ہیں جن کو ایک معین میعاد کے اندر تیار کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ جن لوگوں کو ان کی ضرورت ہے وہ اس عرصہ تک انتظار کریں۔ اس صورت میں اشیاء کی قیمت ان مصارف سے متعین ہوتی سمجھی جائے گی جو ان کے ازسرنو تیار کرنے میں عائد ہوتے ہوں۔ مگر یہ بات ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی کیونکہ ایک

نہایت قدیم زمانے کی کل کو ان مصارف سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اس کے نئے سرے سے تیار کرنے میں عائد ہوتے ہیں۔ کل تو ویسی تیار ہو سکتی ہے مگر چونکہ یہ پرانی کل آثار قدیمہ میں سے تصور کی جائے گی اس واسطے اس کی قدر یا قیمت بہت زیادہ ہوگی۔

پس معلوم ہوا کہ اشیاء کی قدر یا قیمت (کیونکہ قیمت بھی قدر ہی کی ایک صورت ہے) افادت محنت ابتدائی یا ان مصارف پر جو ان کی از سر نو تیار کرنے میں عائد ہوں، منحصر نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تینوں قدر کی عوارضات ضرور ہیں تاہم اس کی ماخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ پھر وہ کون سا کلیہ اصول ہے جس پر اشیاء کی قدر کا دارومدار ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قدر اشیاء قانون طلب و رسد کے عمل پر انحصار رکھتی ہے[9] جس کی توضیح ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سہولت کے لیے ہم پہلے قانون طلب کا مفہوم واضح کریں گے۔ بعد میں قانون رسد کا اور پھر دونوں توضیحات کو یکجا کر کے ایک وسیع قانون قائم کریں گے۔ طلب سے مراد کسی شے کی اس خاص مقدار سے ہے جو کسی خاص قیمت پر خرید کی جائے۔ اس تعریف میں ہم نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اس مقدار کی قیمت کا ادا کرنے والا حقیقی طور پر اس قیمت کو ادا کر سکنے کی قوت رکھتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ طلب اور خواہش حصول مرادف نہیں تصور کیے جا سکتے کیونکہ ہر شخص ہر شے کے حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے، اگرچہ اشیاء مذکورہ کے خرید کر سکنے کی قوت اس میں نہ ہو۔ اس کے علاوہ تعریف مندرجہ بالا میں الفاظ ''خاص قیمت'' بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ قیمت کے تغیر سے شے مطلوب کی مقدار میں بھی تغیر مطلوب ہو گا۔ قانون طلب کے ذریعہ تغیر قیمت سے وابستہ مقدار مطلوب کے تغیر کی توضیح ہوتی ہے[10] یعنی جب کسی شے کی قیمت کم ہو جاتی ہے تو (بشرطیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی رہے) اس کی مقدار مطلوب بڑھ جاتی ہے اور برعکس اس کے جب قیمت زیادہ ہو جاتی ہے تو مقدار مطلوب کم ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا ہے ''بشرطیکہ زر نقد کی قیمت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی رہے۔'' اس قید کا ہونا ضروری ہے کیونکہ جوں جوں کسی شخص کے وسائل آمدنی ترقی کریں گے یا یوں کہو کہ جس قدر کوئی شخص زیادہ دولت مند ہوتا جائے گا اسی قدر اس میں اشیاء کو زیادہ قیمت کے عوض میں خرید کر سکنے کی قوت بڑھتی جائے گی اور جس قدر اس کے وسائل آمدنی کم ہوتے جائیں گے یا جوں جوں وہ رقم جو اس کے پاس ہے، کم ہوتی جائے گی، اسی قدر اس کی قوت خرید بھی کم ہوتی جائے گی۔ اگر پہلی صورت میں وہ ایک شے کو دس روپیہ کے عوض میں

خرید کر سکتا تھا تو دوسری صورت میں پانچ روپیہ کو بھی نہ خرید کر سکے گا۔ اگرچہ ضرورت دونوں صورتوں میں ایک سی ہی کیوں نہ ہو۔ پس اس قانون کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اشیاء کی مقدار مطلوب کمی قیمت سے بڑھتی ہے اور زیادتی قیمت سے کم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر چھاتوں کی قیمت بڑھ جائے تو بہت سے خریدار جو پہلے چھاتے استعمال کیا کرتے تھے اب ان کا استعمال ترک کر دیں گے اور صرف وہی لوگ ان کو خرید کریں گے جو زیادہ قیمت کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا چھاتوں کی مقدار مطلوب کم ہو جائے گی اور اگر قیمت کم ہو جائے تو بہت سے لوگ جو پہلے چھاتوں کو استعمال نہیں کرتے تھے اب کمی قیمت کی وجہ سے استعمال کرنے لگ جائیں گے لہٰذا ان کی مقدار مطلوب میں زیادتی ہو جائے گی۔

علیٰ ہذا القیاس رسد سے مراد کسی شے کی اس خاص مقدار سے ہے جو کسی خاص قیمت کے عوض میں فروخت کیے جانے کے لیے پیش کی جائے اور قانون رسد کو عام الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ جس قدر قیمت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر (بشرطیکہ زرنقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضہ میں ہو مساوی رہے) مقدار اشیاء فروختنی بڑھتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ جب کسی شے کی قیمت زیادہ ملے گی تو ہر تاجر اسی شے کی تیاری پر سرمایہ صرف کرے گا اور اگر کم ملے گی تو کوئی شخص اس شے کی تیاری پر سرمایہ صرف نہ کرے گا لہٰذا مقدار مطلوب پہلی صورت میں بڑھے گی اور دوسری صورت میں کم ہوگی۔

اب ہر دو قوانین مذکورہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ چونکہ ان دونوں میں ایک قسم کا اختلاف ہے اس واسطے تبادلہ اشیاء کے لیے ضروری ہے کہ ان کی طلب و رسد میں ایک مساوات پیدا ہو۔ ورنہ تبادلہ محال ہوگا اور جب تبادلہ محال ہوگا تو قدر کی تعین کس طرح ہوگی۔ لہٰذا مختلف اقتصادی اسباب کے اثر سے اشیاء کی طلب اور رسد میں خود بخود ایک مساوات پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کو بطور قانون کے اس طرح قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہر منڈی میں اشیاء کی قیمت ان کی مقدار مطلوب اور مقدار فروختنی کی مساوات سے متعین ہوگی۔ اگر مانگ زیادہ ہوگی اور رسد کم، تو اشیاء کی قیمت معمول سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر مانگ کم ہوگی اور رسد زیادہ تو قیمت مذکور معمول سے کم ہو جائے گی۔ پس اشیاء کی قیمت صحیحہ (اس اصطلاح کا مفہوم ابھی واضح ہو جائے گا) کی تعیین کے لیے یہ ضروری ہے کہ طلب اور رسد میں مساوات پیدا ہو۔ یعنی اشیاء کی طلب (11) ان کی رسد کے مساوی ہو۔

اس قانون کے معانی کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کی خاطر ہم مثال کے طور پر ایک

جزیرہ فرض کرتے ہیں جہاں ایک ہزار کسان آباد ہیں۔ فرض کرو کہ ان لوگوں کو اپنے کھیتوں کے لیے کھاد کی ضرورت ہے اور ہر کسان کھاد کے پانچ چھکڑوں کے عوض میں غلے کے دس پیمانے دینے کو تیار ہے۔ اس حساب سے گویا کھاد کے پانچ ہزار چھکڑے مطلوب ہیں جن کی قیمت فی چھکڑا دو پیمانے غلہ ہو۔ مگر ممکن ہے کہ قیمت مذکور پر کھاد کی رسد پانچ ہزار چھکڑوں سے زیادہ ہو یا کم۔ بعض آدمی شاید اس قیمت پر کھاد فروخت کرنے کی نسبت ماہی گیری پر گزارہ کرنا زیادہ فائدہ مند تصور کریں۔ اس طرح اگر کسان زیادہ قیمت نہ دیں گے تو کھاد کی رسد مطلق نہ ہوگی اور اگر ہوگی تو بہت کم، جو ان سب کے درمیان تقسیم ہوگی۔ لیکن اگر بعض کسان زیادہ قیمت دینے پر راضی ہو جائیں گے تو قیمت کی زیادتی کی وجہ سے وہ لوگ ماہی گیری ترک کر دیں گے جو پہلے کھاد مہیا کرتے تھے اور کھاد کی رسد پھر زیادہ ہو جائے گی۔ برخلاف اس کے اگر کسی قدرتی سبب سے کھاد کی رسد زیادہ ہو جائے تو جب تک اس کی طلب میں اس قدر زیادتی نہ ہوگی، تمام کھاد بیچنے والے ایک دوسرے کی نسبت مقابلتاً قیمت کو کم کرتے جائیں گے کیونکہ ہر ایک کی خواہش یہی ہوگی کہ میرا ذخیرہ جلد بک جائے۔ قدرتاً ہر شخص کو اپنا فائدہ متصور ہوگا، خواہ دوسرے کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

مثال بالا سے قانون طلب و رسد کا مفہوم تو واضح ہو گیا لیکن ابھی اس سوال کا جواب دینا باقی ہے کہ طلب و رسد میں مساوات کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے ابھی اصطلاح مقابلہ کا استعمال کیا ہے جس کے مفہوم کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے کیونکہ اس مقابلے کے اثر سے ہی طلب و رسد کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے لہٰذا یہ بیان کرنے سے پیشتر کہ مساوات مذکور مقابلہ کے عمل سے کس طرح قائم ہوتی ہے پہلے اس کا مفہوم واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس اصطلاح سے مراد اس مقابلے یا تجارتی رشک سے ہے جو کسی شے کے خریداروں اور بیچنے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ کم سے کم مقدار دے اور اس کے عوض میں زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل کرے۔ مقابلہ کا عمل باہمی اتحاد، رواج اور انسانی اثرات کے منافی ہے کیونکہ ہر شخص قدرتاً اپنی ذات کے لیے کام کاج کرتا ہے جہاں چاہے اپنے مال کو فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ رواج کی پابندی اس کو کسی خاص مقام میں بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتی اور نیز قدرتاً ہر شخص کو اپنی ذاتی منفعت متصور ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کے نقصان وغیرہ کی اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔ یہ ہے مقابلے کا اقتصادی مفہوم۔ اب اس کا اثر سمجھنے کے لیے ذرا مثال مندرجہ بالا پر غور کرو۔ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ کھاد بیچنے والے

مقابلے کی وجہ سے قیمت کم کرتے جائیں گے۔ اگر فی چھکڑا غلے کے دو پیمانے دیئے جائیں تو صاف ظاہر ہے کہ طلب اور رسد غیر مساوی ہوں گے کیونکہ کھاد فروختنی کی مقدار تو دس ہزار چھکڑا ہے، لیکن مانگ صرف پانچ ہزار چھکڑوں کی ہے[12]۔ اگر قیمت اس سے بھی کم ہو جائے تو رسد شاید ۹ ہزار چھکڑے رہ جائے گی کیونکہ بہت سے کھاد بیچنے والے کھاد مہیا کرنے کا کام چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جائیں گے۔ فرضاً اگر کسان یہ سمجھ کر کہ مقررہ مقدار کی نسبت زیادہ کھاد ڈالنے سے زمین کے محاصل یا پیداوار میں سے کھاد کی اس زیادہ مقدار کی قیمت نکل آئے گی اور اس خیال سے اور کھاد خریدنا شروع کر دیں، تو کھاد کی طلب جہاں پہلے پانچ ہزار چھکڑا تھی، اب شاید چھ ہزار چھکڑا ہو جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر قیمت اور کم ہو جائے تو رسد اور بھی کم ہو جائے گی۔ پہلے رسد ۱۰ تھی اور طلب ۵۔ پھر رسد ۹ ہوگئی اور طلب ۶۔ اسی طرح طلب شاید ۷ ہو جائے اور رسد ۸۔ غرضیکہ دونوں مقداریں مقابلے کے اثر سے ایک دوسرے کے قریب ہوتی جائیں گی۔ فرض کرو کہ اس وقت جب کہ طلب اور رسد کی درمیانی نسبت ۷:۸ کی ہے، کھاد کی قیمت فی چھکڑا ۱½ پیمانہ گیہوں پر ٹھہر گئی ہے۔ اب یہ بات کہ طلب اور رسد کے درمیان پوری مساوات کسی ایسی قیمت پر ہوگی جو قیمت مذکورہ سے بہت کم یا کسی قدر کم ہو، دو امور پر منحصر ہے۔

(1) کھاد کی اس مقدار کی افادت انتہائی[13] پر جو سات ہزار چھکڑوں سے زائد ہوگی۔

(2) کھاد بیچنے والوں کی کوئی اور فائدہ مند پیشہ اختیار کر سکنے کی استطاعت پر۔ فرضاً اگر کوئی کسان اڑھائی پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ۱۰ چھکڑے خرید کرے تو یہی قیمت مقرر ہو جائے گی، بشرطیکہ کوئی کھاد بیچنے والا قیمت مذکور سے کم قیمت پر کھاد مہیا کرنے پر راضی نہ ہو۔ لیکن اگر اس کسان کو سوا دو پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے کھاد مل جائے تو وہ شائد پانچ چھکڑے اور خرید کرلے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو سوا دو پیمانہ گیہوں سے ہی کھاد کی افادت انتہائی متعین ہوگی اور یہی اس کی قیمت فی چھکڑا قرار پا جائے گی۔ اس طرح اگر اس کو ۲ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو افادت انتہائی اسی نرخ سے متعین ہوگی۔ علیٰ ہذا القیاس سوا پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو یہی قیمت قرار پائے گی۔ الغرض ممکن ہے کہ کسان اس طرح کھاد کے بیس چھکڑے خرید لے، لیکن ظاہر ہے کہ کھاد کے مختلف حصص کی افادت مختلف ہے۔ اگر یہ کسان بیس چھکڑے کھاد کے

ایک ہی دفعہ خرید لیتا تو ہر چھکڑے کے لیے اسے مساوی قیمت ادا کرنی پڑتی اور یہ قیمت ڈیڑھ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ہوتی۔ کیونکہ منڈی میں (بشرطیکہ مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو) ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ان کی افادت انتہائی سے متعین ہوتی ہے اور بالعموم مساوی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اسباب اشیاء کی قیمت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں، لیکن ان بواعث پر ہم آگے چل کر غور کریں گے۔ فی الحال ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کسی شے کی قیمت صحیح اس قیمت سے کیوں مختلف ہوتی ہے۔ جس پر وہی شے تجارت کی منڈی میں فروخت ہوتی ہے؟

لفظ منڈی کی کئی تشریحات کی گئی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر تجارتی شے کی ایک نہ ایک منڈی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً لوہے کی منڈی، چائے کی منڈی وغیرہ۔ علیٰ ہذا القیاس ایک ہی قصبے میں اشیاء کا تبادلہ کرنے والوں کے مختلف فریق ہوتے ہیں جن کے درمیان ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مختلف ہو۔ پس لفظ منڈی سے مراد وہ تمام افراد ہیں [14] جن کی طلب یا رسد کسی خاص مقام میں کسی خاص شے کی قیمت پر اثر کرے۔

اگر مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو کسی شے کی قیمت ہمیشہ اس کے مصارف پیدائش کے قریب ہوگی۔ یعنی شے مذکور کی رسد کے اس حصہ کے مصارف پیدائش پر جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ قیمت گویا اس شے کی افادت انتہائی کا پیمانہ ہوگی یعنی اس حصے کی افادیت انتہائی کا جس کو خریدار اس خاص قیمت پر بغیر اندیشہ نقصان کے خریدنا قبول کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ قیمت ان مساعی اور تکالیف کا معاوضہ ہوگی جو اس کے پیدا کرنے والوں کو نہایت نامساعد حالات میں کام کرنے کی وجہ سے لاحق ہوئی ہیں، لیکن چونکہ تمام خریدار اس شے کی مساوی قیمت ادا کریں گے اس واسطے ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اسے مساعد حالات میں پیدا کیا ہے ان کو فائدہ ہوگا۔ یعنی ان کا اجر ان تکالیف و مساعی سے زیادہ ہوگا جو اس کی تیاری کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن لوگوں نے اسے نامساعد حالات میں پیدا کیا ہے ان کا اجر بمشکل ان کی مساعی اور تکالیف کے برابر ہوگا۔ مثلاً فرض کرو کہ چند شخص نہایت مساعد حالات میں کام کرتے ہیں یا یوں کہو کہ ایک ایسی کان کھودتے ہیں جس پر معمولی محنت اور سرمایہ صرف کرنے سے عمدہ لوہا بافراط نکل آتا ہے ظاہر ہے کہ یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت بدرجہا فائدے میں رہیں گے جو اسی کام کو نامساعد حالات میں کرتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ایسی کان

کھودتے ہیں جس سے لوہا نکالنے میں بہت سی محنت اور کثیر سرمایہ درکار ہے۔ مقدم الذکر فریق کے فائدے کی وجہ یہ ہے کہ خریدار دونوں کانوں کے لوہے کو مساوی قیمت پر ہی خریدنا قبول کریں گے جس سے پہلا فریق فائدہ میں رہے گا اور دوسرے فریق کو بمشکل اپنے اصل مصارف ہی پلّے پڑیں گے۔

اگر لوہا بیچنے والوں کے درمیان مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو لوہے کی قیمت رفتہ رفتہ اس کے مصارف پیدائش [15] کے قریب آ جائے گی۔ یہی قیمت جو مقابلے کی وجہ سے مصارف پیدائش کے قریب ہو جاتی ہے۔ علم الاقتصاد کی اصلاح میں قیمت صحیحہ [16] کہلاتی ہے۔ لیکن چونکہ مقابلہ کبھی پورے طور پر عمل نہیں کرتا، اس واسطے منڈی میں ہر تجارتی شے کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے جس کو اصطلاح میں قیمت متعارف [17] کہتے ہیں اور یہ قیمت قیمت صحیحہ سے کم و بیش مختلف ہوتی ہے کیونکہ اس سے بالعموم کسی شے کے مصارف پیدائش کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ خریدار کے لیے اس شے کی افادت انتہائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کا یہ اختلاف مندرجہ ذیل وجوہ پر مبنی ہے۔

(۱) کسی شے کے ذخیرے [18] کی مقدار پر جو منڈی میں موجود ہو۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ذخیرہ اور رسد [19] مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ ذخیرے سے مراد کسی شے کی اس تمام مقدار سے ہے جو ایک خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو اور رسد سے مراد کسی شے کی اس مقدار سے ہے جو فروخت کے لیے پیش کی جا سکتی ہو اگرچہ منڈی میں حقیقتاً موجود نہ ہو۔ لہٰذا ممکن ہے کہ رسد ذخیرے کا ایک تھوڑا سا حصہ ہو۔ مثلاً جب کسی شے کی قیمت کم ہو تو دکاندار قدرتاً اس شے کا سارا ذخیرہ نہیں بلکہ اس کا تھوڑا سا حصہ فروخت کے لیے پیش کریں گے جو اس صورت میں رسد کہلائے گا۔ جب قیمت بڑھے گی وہ پہلے کی نسبت ذخیرے کی زیادہ مقدار فروخت کے لیے پیش کریں گے۔ غرض کہ قیمت کی زیادتی کے ساتھ ذخیرہ رسد کی صورت میں منتقل ہوتا جائے گا۔ برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی منڈی میں رسد کی مقدار ذخیرے کی مقدار سے زیادہ ہو۔ مثلاً تجارتی دلال عموماً اشیاء کی ایک کثیر مقدار غلہ، روئی وغیرہ مہیا کرنے کا خریداروں سے معاہدہ کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں مقدار معہودہ اس وقت اول تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی ہے تو بہت کم۔ چونکہ خریداروں کی طلب اشیاء کی روزانہ پیداوار سے نہیں بلکہ ان کے ذخیرے سے پوری ہوتی ہے، اس واسطے ممکن ہے کہ اس

ذخیرے کی کمی بیشی اشیاء کی قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کے درمیان اختلاف پیدا کر دے۔ مثلاً اگر کسی سال کمی رسد کی وجہ سے غلے کی قیمت زیادہ رہی ہے تو دوسرے سال اس کی کاشت زیادہ ہو گی اور اس مزید ذخیرے کی وجہ سے جو اس طرح پیدا ہو گا ممکن ہے کہ قیمت معمول سے بھی کم ہو جائے۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر غلے کی رسد کم ہے تو اس کی جگہ مکئی بکنی شروع ہو جائے۔ اس صورت میں غلے کے ذخیرے کی کمی بیشی اس کی قیمت متعارف پر کچھ اثر نہیں کر سکتی۔ علیٰ ہذا القیاس بعض اشیاء ذخیرہ کھا سکتی ہیں بعض میں ذخیرہ کیے جانے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ یہ سبب بھی ذخیرے کی قیمت متعارف پر اثر کرتا ہے۔ مثلاً بعض اشیاء مچھلی وغیرہ (جو ذخیرہ نہیں کھا سکتی) کی قیمت منڈی میں صبح کچھ ہوتی ہے، شام کچھ۔

(۲) محنت کی تنظیم اور کلوں کا استعمال جس کی وجہ سے محنت کے لیے کسی اور پیشے اور سرمائے کے لیے کسی اور صورت میں منتقل ہو جانا مشکل ہو جاتا ہے، قیمت صحیحہ اور قیمت متعارف کے اختلاف کا دوسرا سبب ہے۔ محقق مارشل فرماتے ہیں کہ ''جن پیشوں میں سرمایہ قائم کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے ان میں اشیاء کی قیمتیں بہت تغیر پذیر ہوتی ہیں۔'' تمھیں یاد ہو گا کہ طلب و رسد کی توضیح کرتے ہوئے ہم نے کھاد مہیا کرنے والوں کی مثال لی تھی۔ ایسی مثال لینے سے ہماری غرض یہ تھی کہ پیشۂ مذکور میں قیمت صحیحہ اور قیمت متعارف کے اختلاف کا یہ دوسرا سبب کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہاں نہ بڑی کلوں کی ضرورت ہے نہ بڑے ہنر مند پیشہ وروں کی جن کی محنت کسی دوسرے پیشے میں منتقل ہو سکتی ہو۔

(۳) بسا اوقات رسم و رواج اور قانون سے بھی اشیاء کی قیمت متعارف متعین ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پیشہ وروں کے عادات اور ان کے طبائع بھی بعض دفعہ قیمت کی کمی بیشی پر بہت بڑا اثر رکھتی ہیں۔ جب کسی پیشے کے دستکاروں کی یومیہ اجرت ایک دفعہ مقرر ہو گئی، پھر سالوں تک بالعموم وہی اجرت مقرر رہتی ہے۔ خواہ دستکاروں کی تعداد پہلے کی نسبت زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ تم نے سنا ہو گا نکاح پڑھانے والے مولوی اپنی خدمت کے عوض بالعموم سوا روپیہ ہی لیا کرتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں افادت انتہائی کا اصول معطل ہو جاتا ہے، اور قیمت رواج سے متعین ہوتی ہے۔ باپ اپنے مریض بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے کئی ہزار روپیہ دینے

کے لیے بھی تیار ہوگا مگر رواج کے اثر سے اسے حکیم کو وہی دو روپیہ نذرانہ دینے ہوتے ہیں۔

قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کے درمیان جو اختلاف ہوتا ہے اس کے بعض اخلاقی وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً بعض دفعہ دکاندار افزائش قیمت کی توقع میں اپنا ذخیرہ اشیاء فروخت کے لیے منڈی میں لاتے ہی نہیں۔ اگرچہ نفع کی امید میں ان کو بسا اوقات نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے خوردہ فروشی کی صورت میں ان اخلاقی وجوہ پر غور کرنا اور بھی ضروری ہے۔ ہم نے اوپر بیان کیا تھا کہ اگرچہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مساوی ہوتی ہے، تاہم بعض اسباب اس مساوات کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ بالعموم خریدار ایسے ہوشیار نہیں ہوتے کہ اشیاء خریدنے کی اصل وقعت کو سمجھتے بوجھتے ہوں۔ اس واسطے دکاندار انہیں سادہ لوح سمجھ کر دھوکا بھی دے دیا کرتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی اشیاء کو دگنی چوگنی قیمت پر بیچ لیتے ہیں۔ چونکہ ہر دکاندار اس طرح نہیں کرتا، اس واسطے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی قیمت میں مساوات قائم نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے بعض مصنفین کی رائے ہے کہ خوردہ فروشی کی صورت میں اشیاء کی قیمت مقابلے سے نہیں بلکہ رواج سے متعین ہوتی ہے اور اس وجہ سے یہ امر معمولاً مسلم ہے کہ خوردہ فروشوں کو اصول عدل و اخلاق کے رو سے اپنے اشیاء کی قیمت اس قدر لینی چاہیے کہ تجارتی لحاظ سے اس قیمت سے کم قیمت قبول نہ کی جا سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل الرائے کے نزدیک خوردہ فروشی اقتصادی اصول پر نہیں بلکہ اخلاقی اصول پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاص خاص حدود کے اندر یہ بات صحیح ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تجارت کا یہ حصہ بھی مقابلے کے اثر سے معرا نہیں ہے۔

حوالہ جات:۔

(1) ملاحظہ ہو حصہ اول باب اول (مرتب)

(2) اصل عبارت میں "شخصوں" تھا جسے ہم نے "اشخاص" سے تبدیل کر دیا ہے۔ (مرتب)

(3) افادت سے مراد Utility ہے۔ جدید اہل قلم اسے "افادہ" یا "افادیت" کی اصطلاحات سے موسوم کرتے ہیں۔ (مرتب)

(4) "دقت حصول" سے مراد "قلت" "کمی" یا "کمیابی" (Scarcity) ہے۔ (مرتب)

(5) ''افادت انتہائی'' سے مراد ''افادہ مختتم'' ہے۔ جسے انگریزی میں Marginal Utility کہتے ہیں۔ (مرتب)

(6) اصل نسخے میں لفظ ''کسی'' نہیں تھا (مرتب)

(7) اصل نسخے میں یہاں لفظ ''اس'' تھا (مرتب)

(8) اصل میں یہاں کلمہ ''کی'' تھا (مرتب)

(9) (حاشیہ از مصنف) بعض حکماء ریکارڈو، سمتھ وِل وغیرہ کہتے ہیں کہ بعض اشیاء کی قدر تو ان کی طلب و رسد کی درمیانی نسبت پر انحصار رکھتی ہے مگر بعض کی ان کے مصارف پیدائش پر۔ یہی وجہ ہے کہ مِل کو اشیاء مادیہ کی تقسیم کرنی پڑی اور ہر قسم کے لیے خاص قوانین وضع کرنے پڑے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ رائے صریحاً غلط ہے۔ کیونکہ جیسا طالب علم کو آگے چل کر معلوم ہوگا یہ ایک غلط اصول پر مبنی ہے۔ ''یعنی اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہے جو ابتداً ان کی تیاری میں صرف ہوئی ہو۔'' یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مختلف مقادیر اقتصادیہ کے لیے مختلف قوانین ہوں۔ علم الاقتصاد بھی دیگر علوم طبعیہ کی طرح ہے۔ جس طرح ان علوم میں یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض فطری مظاہر کی توجیہہ کے لیے ایک خاص قانون ہو اور بعض کی توجیہہ کے لیے کوئی اور مختلف قانون ہو۔ اسی طرح یہ بات علم الاقتصاد میں بھی محال ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اکثر صورتوں میں مقابلہ (مراد ہے (Competition) جس کے لیے اردو میں مروجہ اصطلاح ''مسابقہ'' ہے: مرتب) یا تجارتی رشک کے اثر کی وجہ سے اشیاء کی قیمت ان کے مصارف پیدائش کے قریب قریب آ جائے گی اور ریکارڈو کا اصول صحیح معلوم ہوگا، لیکن یہ بات ہر حالت میں درست نہیں ہے۔ بعض دفعہ غلط اصول سے بھی واقعات کی توجیہ ہو جایا کرتی ہے، لیکن اس توجیہ سے اصول کی صحت کی نسبت رائے قائم کرنا صریحاً قوانین منطق کے خلاف ہے۔ قدیم حکماء کا مذہب تھا کہ اجسام کی حرکت قدرتاً کم ہو جانے کا میلان رکھتی ہے یہاں تک کہ آخر کار بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اس اصول سے کئی فطری واقعات کی توجیہ ہو سکتی تھی، لیکن زمانہ حال کے حکماء نے اس اصول کی صحت کو تسلیم نہیں کیا۔ اگرچہ اس اصول کے نتائج کو انہوں نے مان لیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک حرکت اجسام قدرتاً کم ہوتے جانے کا میلان نہیں رکھتی۔ بلکہ ہر صورت میں بعض اسباب (مثلاً ہوا کی روک یا رگڑ وغیرہ) ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس حرکت کو روکتے ہیں اور آخر کار اس کو معدوم کر دیتے ہیں۔

(10) یہ پورا جملہ از سرِ نو ترتیب دیا گیا ہے۔ اصل جملہ یہ تھا ''مقدار مطلوب کے تغیر سے جو تغیر قیمت کے ساتھ وابستہ ہے قانون طلب کی توضیح ہوتی ہے۔'' یہ جملہ گنجلک ہونے کے باعث مفہوم کو ٹھیک ٹھیک ادا نہیں کر رہا تھا۔ (مرتب)

(11) اصل عبارت میں یہاں ''مطلوب'' تھا جو نامانوس ہے۔ اس لیے ہم نے اسے ''طلب'' سے بدل دیا ہے۔ (مرتب)

(12) (حاشیہ از مصنف)۔ کسی شے کی رسد صرف اسی مقدار تک ہی محدود نہیں ہے جو کسی خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو، بلکہ اس تمام مقدار سے ہے جو اس شے کے بیچنے والے کسی خاص نرخ پر منڈی میں لانے کے لیے تیار ہوں، جب تک کہ شے مذکور کی طلب قائم رہے اس واسطے اس مثال میں ہم نے فرض کر لیا ہے کہ کھاد بیچنے والے دن بدن کھاد کی زیادہ سے زیادہ مقدار منڈی میں لاتے رہتے ہیں۔

(13) Marginal Utility (مرتب)۔

(14) یہاں الفاظ میں معمولی تغیر کیا گیا ہے۔ اصل مسودہ میں "وہ" کی جگہ "ان" تھا اور "ہیں" کی جگہ "ہے" (مرتب)۔

(15) "مصارف پیدائش" Cost of Production کا ترجمہ ہے۔ جدید اہل قلم اسے "مصارف پیداوار" کہتے ہیں۔ (مرتب)

(16) Equilibrium Price (مرتب)

(17) Current Price (مرتب)

(18) Stocks (مرتب)

(19) Supply (مرتب)

باب دوم

تجارت بین الاقوام

گزشتہ باب میں ہم نے تعین قدر پر بحث کی ہے اور اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اشیاء تجارتی کی قدر قانون طلب و رسد کے عمل پر منحصر ہے۔ مگر اس باب میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ قانون تجارت کی ہر صورت میں صادق ہے؟ ممکن ہے کہ جب تبادلہ اشیاء ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتا ہو تو تعیین قدر اسی قانون کے تابع ہو۔ مگر جب یہ تبادلہ مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان ہوتا ہو تو اختلاف حالات کی وجہ سے تعیین قدر کا کوئی اور قانون ہو۔ اس کتاب کے حصہ اول میں ہم نے بیان کیا تھا کہ اختلاف حالات کی وجہ سے علمی اصول میں تغیر آ جانا ممکن ہے۔ لہٰذا اب ہمارا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ آیا تجارت کی ہر دو مندرجہ بالا صورتوں میں قدر اشیاء کی تعیین ایک ہی اصول کے تابع ہے یا مختلف اصولوں کے تحت۔ مگر پیشتر اس کے کہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تجارت بین الاقوام کی عام خصوصیات اور اس کے فوائد سے تمہیں آگاہ کیا جائے۔ بعض محققین کی رائے میں تجارت بین الاقوام اس تجارت سے مختلف نہیں ہے جو ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے کسی نئے اصول کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہی پہلا قانون طلب و رسد یہاں بھی صادق آئے گا۔ یہ حکماء تجارت بین الاقوام پر مختلف اعتراض پیش کرتے ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:۔

(ا) تجارت کبھی مختلف اقوام کے درمیان ہوئی ہی نہیں بلکہ افراد کے درمیان ہوتی ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان باہم تجارت کرتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ ہر دو اقوام میں سے خاص خاص افراد ہیں جو آپس میں تبادلہ اشیاء کرتے ہیں۔ لہٰذا تعیین قدر کا جو قانون تجارت بین الافراد کی صورت میں صحیح ہے، وہی تجارت بین الممالک کی

صورت میں بھی صحیح ہوگا۔

(۲) تجارت کی ہر صورت کے لیے تعیین قدر کا ایک منفرد اصول ہونا چاہیے جو تمام حالات پر حاوی ہو۔ یہ بات علمی اصول کے خلاف ہے کہ ایک ہی قسم کے واقعات کی توجیہ کے لیے مختلف قوانین وضع کیے جائیں۔

(۳) زمانہ حال میں ایجادات کی وجہ سے فاصلہ اور بُعد موانع تجارت نہیں رہے۔ اس واسطے تجارت بین الاقوام یا بین الممالک کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیز کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف ممالک کی تجارتی اغراض میں ایک قسم کی یگانگت ضرور ہے۔ تاہم اقوام و ممالک کا اختلاف ایک ایسا صریح واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کسی ایک ملک کی صورت میں یہ صحیح ہے کہ اس کے مختلف حصص کے درمیان محنت اور سرمایہ یا یوں کہو کہ دستکار اور سرمایہ دار بلا روک ٹوک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں بلکہ اقتصادی لحاظ سے لفظ قوم کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ تجارتی اشیاء کے پیدا کرنے والوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے مختلف اجزا کے درمیان محنت اور سرمایہ بلا روک ٹوک حرکت کر سکتے ہوں۔ اس تعریف کی رو سے لفظ قوم کے مفہوم میں دو شرائط داخل ہیں۔

(۱) ہر ایک مجموعہ کے افراد کے درمیان سرمایہ اور محنت ایک مقام سے دوسرے مقام میں بلا قید منتقل ہو سکتا۔

(۲) ایک مجموعے کے دستکاروں یا کارکنوں کا دوسرے مجموعے کی طرف منتقل نہ ہو سکنا۔ یعنی ایک ملک کے دستکاروں یا سرمایہ داروں کا دوسرے ملک میں نہ جاسکنا۔

مندرجہ بالا اعتراضات کا اصل منشا زیادہ تر یہی ثابت کرنا ہے کہ خصوصاً زمانہ حال میں ایک ملک کے دستکار اور سرمایہ دار دوسرے ممالک میں آسانی سے جاسکتے ہیں کیونکہ فاصلے کی دقتیں جو زمانہ قدیم میں حائل تھیں اب مختلف اقسام کی ایجادات و تسہیل سفر کی وجہ سے مفقود ہو گئی ہیں۔ ہم اس بات کو کسی حد تک تسلیم کرتے ہیں، لیکن باوجود اس بات کے یہ بھی صحیح ہے کہ سرمائے اور محنت کے ایک مجموعہ افراد یا قوم کی طرف جاسکنے میں چند ایسی مشکلات ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔

اول: جغرافی اعتبار سے مختلف ممالک کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے جس کی مقدار بعض دفعہ بہت بڑی ہوتی ہے۔

دوم: مختلف ممالک کی طرز حکومت مختلف ہوتی ہے۔ کہیں مطلق العنان حکومت ہے کہیں جمہوری۔

سوم: مختلف ممالک و اقوام کے مذاہب، اصول معاشرت و رسوم وغیرہ مختلف ہوتے ہیں۔ غرض کہ اگر چہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مختلف اقوام کے درمیان سرمایہ اور محنت حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ تاہم یہ صاف ظاہر ہے اس حرکت میں دقت ضرور ہے اور یہی دقت تجارت بین الاقوام کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیز کرتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اگر کسی ملک کے مختلف حصص کے درمیان سرمایہ اور محنت بلا روک ٹوک حرکت نہ کر سکتے ہوں، تو اس ملک میں تجارتی مقابلہ مفقود ہوگا اور یہ ظاہر ہے کہ مقابلے کی موجودگی یا عدم موجودگی سے تجارتی اشیاء کی قدر میں تغیر آ جاتا ہے۔ جس سے اگر چہ قانون طلب و رسد باطل نہیں ہو جاتا، تاہم متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ مختلف ممالک کے درمیان سرمایہ اور محنت آزادانہ حرکت نہیں کر سکتے۔ پس مندرجہ بالا اصول کے مطابق تجارت بین الاقوام [1] کی صورت میں مقابلے کی عدم موجودگی کی وجہ سے قانون طلب و رسد کو متاثر ہونا چاہیے۔ موجودہ تحقیقات سے ہمارا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ مندرجہ بالا سبب سے یہ قانون کس طرح اور کہاں تک متاثر ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب آگے چل کر دیا جائے گا۔ فی الحال ہم تجارت خارجی کے چند فوائد بیان کرنا چاہتے ہیں۔

تجارت بیرونی یا تجارت بین الاقوام کے ذریعہ سے ہم وہ اشیاء حاصل کر سکتے ہیں جو ہمارے ملک میں پیدا نہ ہوتی ہوں، یا تو اس وجہ سے کہ ہمارے ملک کی آب و ہوا ان اشیاء کی پیدائش کے لیے ناموافق ہے یا لوگوں میں صنعت و حرفت کی قابلیت ہی نہیں ہے کہ ان اشیاء کو تیار کر سکیں۔ غرض کہ تجارت خارجی سے ہر ملک دیگر ممالک کی پیدا کردہ اشیاء سے بہرہ ور ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے اس طریق عمل سے محنت اور سرمائے کی کارکردگی بہت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً انگلستان میں لوہا اور کوئلہ اس کثرت سے پایا جاتا ہے کہ وہاں اس کی پیدائش کے لیے دیگر ممالک کی نسبت محنت اور سرمایہ کم صرف ہوتا ہے، لیکن اس ملک میں ایسی زمین بہت کم ہے جو قابل زراعت ہو۔ وہاں کا غلہ وہاں کے باشندوں کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ اور اگر غلے کی پیداوار کو زیادہ کرنے کی کوشش کی جائے تو بہت سی ناقص زمینیں کاشت کرنی پڑیں گی جس سے غلے کی قیمت بہت گراں ہو جائے گی۔ دیگر ممالک مثلاً فرانس و ہندوستان وغیرہ میں غلہ بافراط پیدا ہوتا ہے اس لیے اگر انگلستان اپنی اشیاء کا مبادلہ ان

ممالک کے غلے سے کرے تو سب کو فائدہ ہوگا۔ ایک زمانے میں یہ خیال مروج تھا کہ بیرونی تجارت سے جو فوائد ہوتے ہیں ان کا تخمینہ اس زر نقد سے لگایا جاتا ہے جو ایک ملک سے دیگر ممالک کی طرف منتقل کیا جائے۔ اس بنا پر ہر ملک کے لوگ یہی تقاضا کرتے تھے کہ اشیاء برآمد میں زیادتی ہو اور اشیاء درآمد میں کمی کی جائے۔ کیونکہ اول الذکر کی زیادتی سے زر نقد ہاتھ آتا ہے اور موخر الذکر کی زیادتی سے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اس غرض کے حصول کے لیے بہت سی تجاویز عمل میں لائی جاتی تھیں۔ برآمد کی مقدار بڑھانے کے لیے انعام دیئے جاتے تھے اور درآمد کی مقدار کو کم کرنے کے لیے طرح طرح کے محصول لگائے جاتے تھے۔ اس طرح مختلف ممالک کے درمیان بجائے اتحاد کے اختلاف پیدا ہوتا تھا۔ اس طریق عمل کو نظام تجارت [2] کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، لیکن اب ایک مدت سے اس کا اصل مغالطہ کھل گیا ہے۔ جس کی توضیح ذیل کی مثال سے ہوسکتی ہے۔ فرض کرو کہ انگلستان اور فرانس کی باہمی تجارت سے صرف یہی مراد ہے کہ انگلستان لوہے کا مبادلہ فرانس کے غلے سے ہوتا رہے۔ نیز فرض کرو کہ فرانس میں ۲۷ من لوہا پیدا کرنے کے لیے اس قدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جس قدر بیس من غلے کے لیے۔ مگر ولایت میں اس قدر سرمایہ اور محنت درکار ہے جس قدر دس من غلے کے لیے۔ اس لیے لوہے کی قدر بلحاظ غلے کے فرانس میں انگلستان کی نسبت دگنی ہے۔ اب اگر انگلستان اور فرانس ان دونوں اشیاء کا باہمی مبادلہ کریں تو دونوں کے حق میں مفید ہوگا۔ اگر فرانس ولایت کے ہر ۲۷ من لوہے کے واسطے ۱۰ من غلہ مبادلے میں دے تو انگلستان کو ۵ من غلہ منافع میں رہے گا۔ علیٰ ہذا القیاس فرانس کو بھی فائدہ ہوگا کیونکہ فرانس ۲۷ من لوہا خود پیدا کرے تو اسے اسی قدر محنت اور سرمایہ صرف کرنا پڑے گا جس قدر ۲۰ من غلے کے پیدا کرنے کے لیے درکار ہے۔ مفروضہ صورت میں اس کو صرف ۵ من غلہ دینا پڑے گا۔ اس لیے دونوں فائدے میں رہیں گے اور کسی کا بھی نقصان نہ ہوگا۔

اس مثال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خارجی تجارت کے فوائد حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری شرط ہے کہ اشیاء متبادلہ کی قدر اضافی ہر دو ممالک میں مختلف ہو، ورنہ تجارت مذکور کا کچھ فائدہ نہ ہوگا، بلکہ اخراجات بار برداری ضائع ہوں گے۔ مذکورہ اختلاف خارجی تجارت کی مقدم شرط ہے اور اصطلاحاً اختلاف مصارف متقابلہ [3] کہلاتا ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ خارجی تجارت کی اس مقدم شرط سے دو مضرت رساں نتیجے پیدا ہوتے ہیں جن سے گریز نہیں کی جاسکتی:۔

(۱) اگر خارجی تجارت اختلاف مصارف متقابلہ پر مبنی ہے تو ممکن ہے کہ بعض ممالک کو

دیگر ممالک سے ایسی اشیاء حاصل کرنے میں فائدہ ہو جن کو وہ خود نسبتاً کم مصارف پر پیدا کر سکتے ہیں۔

(۲) ممکن ہے کہ بعض ممالک خاص خاص اشیاء کا پیدا کرنا ترک کر دیں جن کے لیے وہ قدرتاً یا دیگر اسباب کی وجہ سے نسبتاً زیادہ موزوں ہیں اور یہ سمجھیں کہ ان خاص اشیاء کو دیگر ممالک سے تبادلے میں حاصل کرنا زیادہ مفید ہے۔ ان ہر دو نتائج کا مفہوم ایک مثال سے واضح کیا جا سکتا ہے۔ فرض کرو کہ الف اور ب دو مختلف ممالک ہیں اور ن اور ق دو اشیاء ہیں جن کے پیدا کرنے کے لیے ہر ملک بجائے خود ایک خاص قابلیت رکھتا ہے۔ نیز فرض کرو کہ الف کی قوت پیداوار ۲ن یا ۳ق ہے اور ب کی ا ن یا ۲ ق ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دونوں کے درمیان کوئی تبادلہ نہ ہو تو کل پیداوار ۳ن + ۵ق ہوگی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ن ق سے قدر میں زیادہ ہے۔ کیوں کہ ملک الف میں دونوں کے پیدا کرنے کے لیے اس قدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جس قدر ۳ ق کی پیدائش کے لیے۔ اور ملک ب میں ایک ن کی پیدائش کے لیے اس قدر سرمایہ درکار ہے جس قدر ۲ ق کے لیے۔ لہٰذا ملک الف کے لیے تجارتی لحاظ سے بھی مناسب ہے کہ وہ صرف ن ہی پیدا کرے اور ب کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ صرف ق ہی پیدا کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہے ملک الف کو دونوں اقسام کی اشیاء کی پیدائش میں سہولت ہے اور نیز ق کی پیدائش میں بہ نسبت ن کے اس کو زیادہ سہولت ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان نتائج کو کسی حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام خارجی تجارت اس قسم کی نہیں ہوتی جیسی کہ مثال بالا میں فرض کی گئی ہے۔ بالعموم ہر ملک ایسی اشیاء ہی تبادلے میں لیتا ہے جن کا پیدا کرنا قدرتی طور پر یا دیگر اسباب کی وجہ سے اس ملک کے لیے مشکل ہو۔ پس خارجی تجارت کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہر ملک مستفید ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے کئی دیگر فوائد بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں جو مختصراً مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) خارجی تجارت کی وساطت سے ہر ملک کو بغیر کاوش کے ایسی اشیاء دستیاب ہو سکتی ہیں جن کو یہ بغیر دقت کے پیدا نہ کر سکتا۔

(۲) خارجی تجارت انقسام محنت کی ایک صورت ہے جس سے ہر ملک ان اشیاء کی تیاری میں اپنا سرمایہ صرف کرتا ہے جن کے پیدا کرنے کے لیے وہ خصوصیت سے موزوں ہے اور جن کی

تیاری سے فائدہ کی زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل ہو۔

(۳) خارجی تجارت کی وساطت سے اشیاء کی فروخت کے لیے منڈیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

(۴) خارجی تجارت کی وساطت سے مختلف اقوام کے دستکار اپنی ہنر مندی میں بے انتہا ترقی کر سکتے ہیں۔

(۵) خارجی تجارت سے مختلف اقوام کا میل جول ہوتا ہے جس سے کئی ایک تمدنی اور اخلاقی فوائد پیدا ہوتے ہیں۔

خارجی تجارت کی عام خصوصیات اور فوائد بیان کرنے کے بعد اب ہم اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں یعنی وہ کون سی شرائط ہیں جن کے لحاظ سے خارجی تجارت کا منافع تبادلے کے مختلف فرقوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے؟ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ خارجی تجارت کی خصوصیات ان اشیاء کی قدر پر کس طرح اثر کرتی ہیں جو اس تجارت کا مقصود ہیں؟ یا مختصراً شرح تبادلہ کن اسباب سے متعین ہوتی ہے۔

تجارت بین الافراد کی صورت میں یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ فریقین تبادلہ کے درمیان شرح تبادلہ کیا ہوگی۔ اس مشکل کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں پورے حالات معلوم نہیں ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ بھلا ہمیں کس طرح علم ہو سکتا ہے کہ ایک خاص فرد کو کسی خاص شے کی کس قدر شدید ضرورت ہے، لیکن تجارت بین الاقوام کی صورت میں اقوام کی ضروریات کا اندازہ کسی قدر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تجارت کی اس خاص صورت میں بھی بشرطیکہ مختلف ممالک کے درمیان سرمایہ، محنت اور تجارتی اشیاء بلک روک ٹوک آ جا سکتی ہوں، تعین قدر کا وہی پہلا اصول صحیح معلوم ہوتا ہے، یعنی شرح تبادلہ تجارت بین الاقوام کی صورت میں بھی اس مساوات پر منحصر ہے جو مختلف اقوام کی طلب و رسد اشیاء کے درمیان ہو[4]۔ مثلاً دو ملک ہیں ا اور ب۔ مقدم الذکر لوہا پیدا کرتا ہے اور موخر الذکر شراب۔ ظاہر ہے کہ اگر الف کو شراب کی زیادہ ضرورت ہے اور ب کو لوہے کی اس قدر ضرورت نہیں ہے، تو شراب کی تھوڑی سی مقدار کے عوض میں ب کو بہت سی مقدار لوہے کی دینی ہوگی۔ اس واسطے یہ ممکن ہے کہ کوئی ملک دیگر ممالک سے ایسی اشیاء حاصل کرتا رہے جن کو یہ خود نسبتاً کم مصارف پر پیدا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا اپنا سرمایہ اور محنت ایسی اشیاء کے پیدا کرنے میں صرف ہوتے رہیں جن کے پیدا کرنے کے لیے یہ خصوصیت سے موزوں ہے۔ پس ایسی اشیاء کی قدر جن کو ہم دوسرے ملک سے تبادلے میں حاصل

کرتے ہیں، ان مصارف پر منحصر نہیں ہے جو ان اشیاء کو اپنے ملک میں پیدا کرنے سے ہمیں ادا کرنے پڑتے اور نہ یہ ان مصارف پر منحصر ہے جو اس ملک کو ادا کرنے پڑتے ہیں جہاں یہ پیدا کی جاتی ہیں بلکہ یہ قدر ان اشیاء کے مصارف پیدائش پر منحصر ہے جو ہمیں ان کے عوض میں (کرایہ بار برداری کو ملحوظ رکھ کر) دیگر ممالک کو تبادلے میں دینے پڑتے ہیں۔ مثلاً اوپر کی مثال میں ملک الف میں شراب کی قدر اس لوہے کے مصارف پیدائش پر منحصر ہے جو شراب مذکور حاصل کرنے کی غرض سے تبادلے میں دیا جاتا ہے۔

عام صورتوں میں تو یہ صحیح ہے کہ شرح تبادلہ قانون طلب و رسد کی رو سے متعین ہوتی ہے، مگر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں تجارت بین الاقوام میں چند ایک ایسی خصوصیات ہیں جن سے یہ قانون متاثر ہوتا ہے۔

اول: یہ کہ بعض اوقات فریقین تبادلہ آپس میں اتفاق کر کے ایک خاص شرح تبادلہ مقرر کر لیتے ہیں۔

دوم: اگر اشیاء متبادلہ کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کے تابع ہو تو جب ان کی پیداوار ایک ملک میں نقطہ تقلیل تک پہنچ جائے گی تو دیگر ممالک ضرورت سے مجبور ہو کر اسی شے کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تجارت بین الاقوام کا دائرہ دن بدن تنگ ہوتا جائے گا جس سے شرح تبادلہ پر ایک نمایاں اثر ہوگا۔

سوم: بعض حالات یعنی بعد مسافت اور کثرت مصارف بار برداری [5] وغیرہ کی وجہ سے مختلف اقوام کے درمیان تجارتی مقابلہ مفقود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی سے اشیاء تجارتی کی قدر میں تغیر آ جاتا ہے۔ مثال کے لیے فرض کرو کہ فرانس میں نہایت عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے جو ہندوستان اپنی اشیاء کے تبادلے میں اس سے لیتا ہے۔ نیز فرض کرو کہ دیگر ممالک بعض وجوہ سے اس صنعت میں فرانس کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس صنعت سے فرانس خاصتاً فائدہ اٹھائے گا مگر جب اور قومیں فرانس کا مقابلہ کرنے کو آمادہ ہو جائیں گی اور کاغذ تیار کریں گی تو ظاہر ہے کہ کاغذ کی قدر میں فرق آ جائے گا اور ہندوستان کو اس مقابلے کی وجہ سے فائدہ ہوگا۔

چہارم: بعض اوقات ایسے موانع پیش آ جاتے ہیں کہ دو مختلف ممالک کے تجار کو تبادلہ اشیاء میں مشکلات ہوتی ہیں۔ مثلاً کثرت مصارف بار برداری، دلالوں کی دلالی [6] اور محصول درآمد و

برآمد[7]۔ ان اسباب سے اشیاء کی قدر میں تغیر آ جاتا ہے اور تجار کے فائدے میں کمی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ اسباب بھی شرح تبادلہ پر اپنا اثر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ غرض کہ اس قسم کے بعض اسباب اور بھی ہیں جو شرح تبادلہ پر اثر کرتے ہیں مگر یاد رکھنا چاہیے کہ قانون کلیہ طلب و رسد ان اسباب کے اثر سے باطل نہیں ہو جاتا۔ ہاں اس کا عمل ان کے اثر سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے ولایتی شکر ہمارے ملک میں اس کثرت سے آنی شروع ہو گئی کہ ایک روپے کی پانچ سیر بکنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ملک میں لوگوں نے گنوں کی کاشت ہی چھوڑ دی کیونکہ ولایتی شکر دیسی شکر سے مقابلتاً سستی ملتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر سرکار ہند نے ولایتی شکر پر اب اس قدر محصول درآمد لگا دیا ہے کہ یہ ہماری دیسی شکر سے سستی نہ بک سکے گی۔ اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں ولایتی شکر کی تعیین قیمت قانون طلب و رسد کے اس قدر دخل نہیں ہے جس قدر کہ سرکار دولت مدار کے حاکمانہ فعل کا۔

اس[8] میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب دو ممالک آپس میں تجارت کرتے ہیں تو بسا اوقات ایک ملک دوسرے ملک کا زیر بار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیر بار شدہ ملک کی اشیاء برآمد و درآمد کے درمیان مساوات قائم نہیں رہتی۔ کیونکہ اس کو نہ صرف اپنی درآمد کے عوض میں اشیاء بھیجنی پڑتی ہیں بلکہ اپنے قرض کی ادائیگی میں یا تو اپنی اشیاء برآمد میں زیادتی کرنی پڑتی ہے یا مزید روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس وجہ سے ایک ملک میں روپیہ کی مقدار بڑھتی جاتی ہے اور دوسرے میں کم ہوتی جاتی ہے۔ جہاں روپے کی مقدار بڑھتی ہے وہاں اس کی قدر کم ہوتی ہے اور اشیاء کی قیمت بڑھتی ہے۔ لہٰذا وہاں اشیاء کی فروخت سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی برآمد اس کی درآمد سے بہت زیادہ ہے۔ چونکہ ہم اپنی ضروریات کے لیے انگلستان کے محتاج ہیں اس واسطے ہم زیر بار ہیں۔ علاوہ اس کے ہم کو سلطنت ہند کے مصارف، حکام کی تنخواہیں اور فوجی اخراجات وغیرہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا ملک دن بدن زیادہ سے زیادہ زیر بار ہوتا جاتا ہے۔ مزید برآں ہمارے ملک میں کئی وجہ کے باعث (مثلاً خارجی حملہ آوروں کا ہندوستان کی قدیم جمع کردہ دولت کو لوٹ کر لے جانا، اخیر کے مغلیہ بادشاہوں کی عیاشی، عوام کی ناعاقبت اندیشی اور کمی تعلیم کی وجہ سے روپیہ کی اصل حقیقت سے بے خبری وغیرہ) سرمائے کی مقدار کم ہے۔ انگلستان کے قبضے میں سرمائے کی بے انتہا مقدار ہے۔ اس واسطے ہمارے ملک میں رفاہ عام کے کاموں مثلاً آب پاشی

وغیرہ میں بھی اس ملک کا سرمایہ صرف ہوتا ہے جس سے انگلستان فائدہ عظیم اٹھاتا ہے۔ اگرچہ ہم کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے، جس کی تشریح اس کتاب کے کسی اور باب میں کی گئی ہے۔

چونکہ انگلستان کے مصارف ہمیں پونڈوں میں ادا کرنے پڑتے ہیں، اس واسطے چاندی کی قدر میں تنزل آ جانے کی وجہ سے ہمیں اور بھی نقصان ہوا کرتا تھا، لیکن اب اجرائے سکہ طلائی کے باعث اس مشکل کا اندیشہ نہیں رہا مگر ہمارے نقصان کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک صنعت وحرفت کے میدان میں بہت پیچھے ہے اور اہل ملک بہ سبب کمی تعلیم کے اس ضرورت کو محسوس نہیں کر سکتے۔ ہم صرف وہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جو قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہیں اور صنعتی اشیاء کے لیے دیگر ممالک کے محتاج ہیں۔ گزشتہ چند سالوں سے ہم نے جاپان کی تقلید کر کے صنعت کی طرف کچھ توجہ کی ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریک نہایت مفید ثابت ہوگی اور اہل ملک کے لیے ہر پہلو سے نتیجہ خیز ہوگی۔ اگرچہ ہم فی الحال اس قابل تو نہیں کہ ہمارے ملک کی تیار کردہ اشیاء یورپ کے بازاروں میں بک سکیں، تاہم ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ہندوستانی بھائی بارہ لاکھ کے قریب مختلف بیرونی جزائر مثلاً ماریشس، گائینا، فجی، ٹرینیڈاڈ وغیرہ میں آباد ہیں، جن کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے سے ہمارے ملک کے تاجر بے انتہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حوالہ جات:-

(1) یعنی ان کی نقل پذیری (Mobility) محدود ہے (مرتب)

(2) Mercantilism (مرتب)

(3) Differential Comparative Cost (مرتب)

(4) (حاشیہ از مصنف) یہ امر علوم ریاضیہ کی مدد سے مندرجہ ذیل طور پر ثابت ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس تشریح کی ضرورت نہ تھی تاہم اس خیال سے کہ طلباء کو علوم کی باہمی استمداد کا طریق معلوم ہو، ہم اس کو یہاں درج کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ دو اشیاء متبادلہ ہیں جن کو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے ان کی ذاتی خواص میں کوئی فرق نہیں آتا جتنی مقداروں میں چاہو تقسیم کر کے ان کا باہمی تبادلہ کرتے جاؤ نسبت تبادلہ وہی رہے گی۔ فرض کرو کہ ان کے تبادلے کی وہی نسبت ہے جو ق : ن سے ہے۔ ظاہر ہے کہ ق کا ہر دسواں حصہ یا گیارہواں حصہ ن کے ہر دسویں حصے یا گیارہویں حصے کے عوض میں دیا جائے گا۔ کیونکہ ان اشیاء کے مساوی حصص کے درمیان تمیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پس یہ نتیجہ اس طرح پر ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ $\frac{دق}{دن} = \frac{ق}{ن}$ (د کو ن کے ساتھ ضرب دیئے

سے ہماری مراد اشیاء متبادلہ کے مساوی حصص ظاہر کرنے کی ہے۔اس نتیجہ کو ملحوظ خاطر رکھ کے فرض کرو کہ ل ق گندم کی ایک خفیف سی مقدار ہے اور ل ن آہن کی ایک خفیف سی مقدار جو اس کے عوض میں دی جاتی ہے چونکہ گندم اور آہن دونوں ایسی اشیاء ہیں کہ ان کو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے ان کے خواص ذاتیہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔اس واسطے ظاہر ہے کہ ایک ہی منڈی میں ان کے مساوی حصص کے درمیان نسبت تبادلہ وہی ہوگی جو ان کی کل مقداروں کے درمیان ہے۔لہٰذا اگر ق کل مقدار گندم کی ہو جو ن یعنی کل مقدار آہن کے عوض میں دی جاتی ہے تو ل ن اور ل ق کے درمیان وہی نسبت تبادلہ ہوگی جو ن اور ق کے درمیان ہے۔لہٰذا $\frac{\text{ل ن}}{\text{ل ق}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ یا $\text{ل ن} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}} \times \text{ل ق}$ موازنہ تجارتی کی حالت میں ان ہر دو مقادیر کی طلب ہر دو فریق تبادلہ کے لیے مساوی ہوگی کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اور تبادلے کی ضرورت پڑے گی۔اب دیکھو کہ ل ن یعنی آہن کی مقدار ل ق یعنی گندم کی مقدار سے $\frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ گنا بڑی ہے۔پس ان کی طلب کے درمیان مساوات قائم رکھنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ آہن کی طلب گندم کی طلب سے $\frac{\text{ق}}{\text{ن}}$ گنا بڑی ہو۔جس سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ "اشیاء متبادلہ کی طلب ان مقادیر متبادلہ کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے" اب فرض کرو کہ پہلے فریق تبادلہ یا ا کے پاس گندم کی مقدار س تھی اور دوسرے فریق ب کے پاس آہن کی مقدار ص تھی۔ چونکہ تبادلے میں گندم کا ق حصہ آہن کے ن حصہ کے عوض دیا جاتا ہے اس واسطے تبادلے کے بعد مندرجہ ذیل صورت ہوگی۔الف کے پاس (س۔ق) گندم ہوگی اور ن آہن اور ب کے پاس ق گندم ہوگی اور (ص۔ن) آہن۔ اگر فرضاً الف کی طلب گندم کو اح (س۔ق) سے اور ب کی طلب گندم کو ۲ح ق سے، علیٰ ہذا القیاس الف کی طلب آہن کو اع ن سے اور ب کی طلب آہن ۲ع (ص۔ن) سے تعبیر کیا جائے تو الف تبادلے پر رضامند نہ ہوگا، جب تک کہ مندرجہ مساوات صحیح نہ ہو۔یعنی

$$\text{اح (س۔ق)} \times \text{د ق} = \text{اع ن} \times \text{د ن} \quad \text{یا} \quad \frac{\text{اح (س۔ق)}}{\text{اع ن}} = \frac{\text{د ن}}{\text{د ق}}$$

چونکہ مندرجہ بالا اصول کے مطابق $\frac{\text{د ن}}{\text{د ق}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ ہے لہٰذا $\frac{\text{اح (س۔ق)}}{\text{اع ن}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ علیٰ ہذا القیاس جو کچھ الف کی صورت میں صحیح ہے وہی ب کی صورت میں بھی صحیح ہونا چاہیے یا یوں کہو کہ اس کی طلب آہن (یعنی ان مقادیر آہن کی طلب جن کا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے) ب کی طلب گندم کے مساوی ہونی چاہیے یعنی ان مقادیر گندم کی طلب جن کا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے لہٰذا مندرجہ ذیل مساوات ب کی صورت میں صحیح ہونی چاہیے۔

$$\text{۲ع (ص۔ن)} \times \text{د ن} = \text{۲ح ق} \times \text{د ق} \quad \text{یا} \quad \frac{\text{۲ح ق}}{\text{۲ع (ص۔ن)}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$$

لہٰذا کلیہ اصول یہ قائم ہوا کہ تبادلہ اشیاء (ایسی اشیاء کے لیے جو بغیر ذاتی اوصاف کھوئے مختلف مقادیر میں تقسیم ہو سکتی ہوں) کے لیے مندرجہ ذیل دو مساواتیں صحیح ہونی چاہئیں۔

$$\frac{\text{اح (س۔ق)}}{\text{اع ن}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}} = \frac{\text{۲ح ق}}{\text{۲ع (ص۔ن)}}$$

(5) Costs of transport (مرتب)

(6) Brokerage (مرتب)

(7) Export and Impot Duties (مرتب)

(8) (حاشیہ از مصنف) تبادلہ خارجی * کا مضمون علم الاقتصاد کا ایک بڑا ضروری حصہ ہے، لیکن چونکہ اس کا تعلق زیادہ تر عمل سے ہے اور اس کا کامل طور پر سمجھنا تجربے پر انحصار رکھتا ہے، اس واسطے ہم مختصر طور پر یہ بیان کر دیتے ہیں کہ تبادلات خارجی اس طریق عمل کا نام ہے جس کی وساطت سے قومیں ایک دوسرے کا قرض ادا کرتی ہیں۔ قدیم زمانے میں جب ایک ملک کے سوداگر کسی دوسرے ملک کے سوداگروں کے قرض خواہ ہوا کرتے تھے، تو مقروض ملک سے قرض خواہ ملک کی طرف زر مسکوک ارسال کرنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ دقت مفقود ہو گئی ہے کیونکہ باہمی ہنڈیوں کے استعمال سے زر نقد کے استعمال کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ زمانہ حال میں تبادلے سے مراد کسی اور ملک میں زر نقد کی ایک خاص مقدار وصول کرنے کا حق ہے جس کا اظہار ایک دستاویز کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ کلکتہ کے ایک سوداگر نے دس ہزار روپیہ کا مال ولایت کے ایک سوداگر سے خریدا ہے اور ولایت کا ایک سوداگر کسی ہندوستانی سوداگر کا مقروض ہے۔ مذکورہ بالا طریق عمل کی رو سے کلکتہ کا سوداگر اپنے ہم وطن ہندوستانی سوداگر سے روپیہ وصول کرے گا اور ولایت کا مقروض سوداگر اپنے ہم وطن قرض خواہ سوداگر کو رقم مذکورہ ادا کر دے گا۔ اس طرح دونوں ملکوں کا حساب بغیر ترسیل زر کے بے باق ہو جائے گا، لیکن اگر کسی ملک کے سوداگر کے ذمے کچھ باقی رہ جائے، تو وہ زر نقد کی صورت میں ادا کرنا پڑے گا۔ موجودہ تجارتی نظام میں باقی ادا کرنے کی یہ ذرا سی دقت بھی نہیں رہی، کیونکہ شہر لنڈن انگریزی قوم کی تجارتی حیثیت کی وجہ سے دنیا کا تبادلہ گاہ * بن گیا ہے۔ جس کی معرفت دنیا کی قومیں اپنا حساب کتاب فیصلہ کر لیتی ہیں۔ مثلاً اگر صوبجات متحدہ امریکہ انگلستان کے قرض خواہ ہوں اور دیگر ممالک کے مقروض ہوں تو انگلستان کے دارالسلطنت کی معرفت فیصلہ کرنے سے ممکن ہے کہ ترسیل زر کی نوبت ہی نہ آئے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ یہ دیگر ممالک جو صوبجات متحدہ امریکہ کے قرض خواہ ہیں خود انگلستان کے مقروض ہوں۔ مگر باوجود اس کے ممکن ہے کہ بعض اقتصادی اسباب کا اثر اس امر کا متقاضی ہو کہ شہر لنڈن سے زر مسکوک کی مقدار رفتہ رفتہ خارج ہو کر کم ہوتی جائے۔ ان اسباب کے اثر کو روکنے کے لیے انگلستان کا بنک شرح سود کو زیادہ کر دیتا ہے اور وہاں کے دیگر بنک بھی اس کی تقلید کرتے ہیں۔ جس سے انگلستان میں شرح سود بالعموم متاثر ہو جاتی ہے اور دیگر ممالک کے قرض خواہوں کو اس بات کی تحریک ہوتی ہے کہ وہ زیادہ شرح سود لینے کی غرض سے اپنا روپیہ انگلستان میں ہی رہنے دیں۔

* Foreign Exchange جدید اہل قلم اسے "تبادلہ خارجی" کے بجائے "مبادلہ خارجہ" کہتے ہیں۔ (مرتب)

* Clearing House (مرتب)

باب سوم

زر نقد کی ماہیت اور اس کی قدر

تبادلہ اشیاء انقسام محنت کا لازمی نتیجہ ہے۔ مختلف ممالک بالعموم وہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جن کی پیدائش کے لیے ان کی آب وہوا اور دیگر حالات بالاختصاص موزوں ہوتے ہیں اور اپنی ذاتی ضرورت کی چیزیں ان اشیاء کے تبادلے میں دیگر ممالک سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے تبادلے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کی قدر کا ایک خاص معیار معین کیا جائے۔ کیونکہ محض مبادلے سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر کسی کفش ساز کو ٹوپی کی ضرورت ہو تو ظاہر ہے کہ اسے کسی ایسے کلاہ ساز کی تلاش کرنی چاہیے جس کو جوتی کی ضرورت ہو۔ ورنہ اس کی ضرورت کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا کسی خاص شے کا تعین بطور معیار قدر ضروری ہے، جس کو ہر فرد تبادلے میں قبول کر سکے۔ مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اس غرض کے لیے مختلف اشیاء استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً نمک، چاول، چائے وغیرہ۔ مگر چونکہ ان کے استعمال میں صدہا دقتیں تھیں، اس واسطے ضرورت نے خود بخود ایک ایسی شے دریافت کر لی جو اس غرض کو بوجہ احسن پورا کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کو پورا کر سکنے کے لیے کوئی اس قسم کی شے ہونی چاہیے جو

(۱) ذاتی قدر رکھتی ہو۔

(۲) آسانی سے منتقل ہو سکتی ہو۔

(۳) پرانی ہو جانے سے اس کی قدر میں تغیر نہ آ سکتا ہو۔

(۴) چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو سکتی ہو۔

(۵) تھوڑی مقدار میں قدر زیادہ رکھتی ہو۔

(۶) اس کی قدر بالعموم یکساں رہتی ہو۔

(۷) اس کا کھرا کھوٹا ہونا جلدی پرکھا جا سکتا ہو۔

(۸) اس کے سکے آسانی سے بن سکتے ہوں۔

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ تمام اوصاف بطریق احسن چاندی اور سونے میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا دنیا کی مہذب قوموں نے انہیں دو دھاتوں کو بطور معیار قدر اختیار کرلیا، جس سے تبادلے کی دقتیں مفقود ہوگئیں۔ ذرا خیال تو کرو اگر حروف نہ ہوتے تو خیالات انسانی کے اظہار میں کس قدر دقت ہوتی۔ سونے چاندی کو اشیاء سے وہی علاقہ ہے جو حروف کو ہمارے خیالات سے ہے۔ لہٰذا اس معیار کا دریافت ہونا تمدن انسانی کی تاریخ میں ایجاد حروف سے کم وقعت نہیں رکھتا۔

فرض کرو کسی شراب فروش کو روٹی کی ضرورت ہے اور وہ ایک نان فروش سے کہتا ہے کہ مجھ سے شراب لے لو اور مبادلے میں مجھے روٹی دے دو مگر ممکن ہے کہ نان فروش کو یا تو شراب کی ضرورت ہی نہ ہو یا اگر ہو تو اتنی شراب کی ضرورت نہ ہو جس کی قدر روٹی کی قدر کے مساوی ہو۔ شراب فروش روٹی لے لیتا ہے اور مبادلے میں نان فروش کو اس قدر شراب دے دیتا ہے جس قدر کہ اس کو ضرورت ہے اور بقایا حساب کو بے باق کرنے کے لیے مذکورہ بالا معیار قدر کی کچھ مقدار ادا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر نان فروش کو شراب کی مطلق ضرورت نہ ہوتی تو شراب فروش کو معیار قدر کی زیادہ مقدار ادا کرنی پڑتی۔ اب فرض کرو کہ نان فروش کو شراب کی مطلق ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے کپڑے کی ضرورت ہے۔ معیار قدر کی وہ مقدار جو اس نے شراب فروش سے حاصل کی ہے، جیب میں ڈال کر بزاز کی دکان پر جاتا ہے اور وہاں سے وہ شے حاصل کرتا ہے جس کی قدر اس روٹی کی قدر کے مساوی ہے جو اس نے شراب فروش کے پاس فروخت کی تھی۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جو شے اس کو شراب فروش کی طرف سے واجب الادا تھی وہ بزاز نے مہیا کر دی۔ لفظ واجب الادا پر ذرا غور کرو کیونکہ کسی لفظ میں زر نقد کی پوری حقیقت یا ماہیت مخفی ہے۔ مثال بالا سے واضح ہوتا ہے کہ جب مبادلہ غیر مساوی ہو تو معیار قدر یا زر نقد کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا زر نقد یا معیار قدر اس حق کی علامت ہے جو مبادلہ غیر مساوی کی صورت میں ایک فریق کو دوسرے فریق پر حاصل ہے۔ زمانہ حال میں اس معیار قدر کو زر نقد سے تعبیر کرتے ہیں اور دنیا کی تمام مہذب اقوام نے اس کو اس قسم کے حقوق کی علامت قرار دیا ہے۔ پس زر نقد اس حق کی علامت ہے جو اس شخص کو حاصل ہے، جس نے کسی اور شخص کو کوئی شے دی ہے، یا اس کی کوئی خدمت کی ہے، اور اپنی خدمت یا شے کے مبادلے میں شخص مذکور سے کوئی مساوی القدر شے حاصل نہیں کی یا کوئی

مساوی القدر خدمت نہیں لی۔ اس تعریف سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ زرنقد کی وہ مقدار جو کسی ملک میں متداول ہو حقوق کی اس مقدار کی علامت ہے جو زرنقد کی عدم موجودگی کی صورت میں اس ملک کے درمیان واجب الادا ہوتی یا بطور نتیجہ یوں کہو کہ جس ملک میں یہ حقوق نہیں ہیں وہاں کسی معیار قدر کے تداول کی ضرورت نہیں ہے۔

زرنقد کی ماہیت کی مزید توضیح کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اعتبار یا ساکھ [1] کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔ ساکھ کیا ہے؟ فرض کرو کہ مجھے ایک شے کی ضرورت ہے، لیکن اس کی خرید کے لیے میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے۔ اگر اس شے کے بیچنے والوں کی نگاہوں میں میں ایک معتبر آدمی ہوں تو وہ لوگ میرے اعتبار پر مجھ کو میری ضرورت کی چیز دے دیں گے۔ گویا میں اپنے اعتبار کی وساطت سے وہ شے حاصل کرلوں گا جو زرنقد کی وساطت سے حاصل ہوتی۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ دو کہ وعدہ ادائیگی بھی وہی کام دے سکتا ہے جو زرنقد دیتا ہے۔ جس طرح زرنقد کی ادائیگی ایک قسم کے حق کا تحویل کرنا ہے اس طرح اعتبار کی وساطت سے اشیاء ضرورت کا حاصل کرنا بھی ایک حق کا تحویل کرنا ہے۔ یعنی جس شخص سے میں نے کوئی شے اعتبار پر لی ہے اگر عندالطلب یا کسی مقررہ میعاد کے بعد اس کو کوئی مساوی القدر شے اس شے کے تبادلے یا مبادلے میں نہ دوں گا تو اس شخص کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ قانونی چارہ جوئی کر کے مجھ سے رقم یا شے وصول کرلے۔ مختصراً یوں کہو کہ زرنقد کی طرح اعتبار بھی قوت خرید کا نام ہے اور دونوں ایک قسم کے حقوق ہیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ زرنقد اور اعتبار کی ماہیت ایک ہی ہے اور زرنقد اعتبار ہی کی ایک وسیع اور عام تر صورت کا نام ہے، لیکن باوجود اس امر کے ان کے درمیان ایک باریک فرق ہے، جس کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ علم الاقتصاد میں تمام زرنقد اعتبار ہے لیکن اس قضیے کا عکس سادہ یعنی تمام اعتبار زرنقد ہے صحیح نہیں ہے۔ کوئی شخص کسی دکاندار کو اس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ کسی شے کو زرنقد کے عوض میں یا اعتبار پر فروخت کرے۔ پس جب کوئی شخص کسی شے کے عوض میں زرنقد یا روپے کی کوئی مقدار لیتا ہے تو حقیقت میں یہ اعتبار ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اگر اسے یقین نہ ہو کہ میں اس زرنقد کے عوض میں اور اشیاء لے سکوں گا تو وہ اس زرنقد کو کبھی قبول نہ کرے۔ مگر فرض کرو کہ ایک سودا ہوا ہے، یعنی ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے کوئی شے قرض خریدی ہے عدل اس امر کا متقاضی ہے کہ مقروض کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اپنے قرض خواہ کو اپنے قرض کی ادائیگی میں کوئی شے قبول کرنے پر مجبور کرسکے۔ اگر قرض خواہوں کو یہ اختیار

ہوتا کہ اپنے قرضوں کی ادائیگی میں جو شے چاہیں قبول کریں، تو خیال کرو کس قدر دقت کا سامنا ہوتا۔ پس ہر ملک کا قانون یہ اصول وضع کرتا ہے کہ اگر کسی نے کچھ قرض لیا ہو تو مقروض اپنے قرض کی ادائیگی میں اپنے قرض خواہ کو کوئی خاص شے قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ خاص شے جس کو ادائیگی قرض کی صورت میں مقروض قرض خواہ کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے، اصطلاحاً نقد قانونی [2] کہلاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ بعض صورتوں میں بعض اشیاء نقد قانونی ہیں اور بعض میں نہیں۔ انگلستان میں سکہ طلائی ہر صورت میں نقد قانونی ہے، لیکن چاندی کا سکہ صرف ۴۰ شلنگ تک ہی نقد قانونی ہے۔ یعنی اگر قرض ۴۰ شلنگ سے زیادہ ہو تو قرض خواہ کو اختیار ہے کہ اس سکے کو قبول نہ کرے۔ اگر اس سے کم ہو تو مقروض اسے قانوناً مجبور کر سکتا ہے کہ وہ سکہ سیمین کو اپنے قرض کی ادائیگی میں قبول کرے۔ مندرجہ بالا تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ زر نقد تجارت اور اقوام میں تین ضروری مقاصد کو پورا کرتا ہے۔

(۱) تبادلہ اشیاء کا ایک وسیلہ ہے۔ جوں جوں تجارت اقوام زیادہ پیچیدہ صورتیں اختیار کرتی جاتی ہے توں توں زر نقد کے استعمال کا یہ مقصد زیادہ واضح اور نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں تبادلہ اشیاء کے لیے اس کا وجود ایسا ہی ضروری ہے جیسا اظہار خیالات کے لیے زبان کا استعمال۔ تمام ملکوں میں ٹکسالیں قائم ہیں جہاں ارکان سلطنت کے اہتمام سے سونے چاندی کے سکے بنائے جاتے ہیں، اور ان کی ہر دو طرف وہاں کے شاہی نشانات وغیرہ لگائے جاتے ہیں اور ان سکوں کے بل پر دنیا کی تجارت کا دھندا چلتا ہے۔

(۲) زر نقد کا دوسرا مقصد پہلے مقصد سے بطور نتیجے کے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ اشیاء کی قدر کا معیار ہے، لیکن یہاں ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی زر نقد کی ذاتی قدر کس امر پر منحصر ہے۔ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ ہم اصطلاح ''زر نقد کی قدر'' کا مفہوم ذہن نشین کر لیں۔ کیونکہ مل صاحب نے اس اصطلاح کے سمجھنے میں ایک غلطی کھائی ہے جو اوروں کو بھی دھوکے میں ڈال سکتی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ کسی شے کی قیمت سے مراد اس شے کی قدر سے ہے جس کا اندازہ زر نقد یا اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ اس زر نقد کی قدر سے مراد کسی اور شے کی مقدار سے ہے جو اس زر نقد کے عوض میں دی جائے۔ مثلاً کوئی مادی شے یا خدمت ملازمین یا کوئی اور حق ملکیت کا یا کوئی قرضہ وصول کرنے کا۔ اگر زر نقد کی ایک خاص مقدار کے عوض میں کسی شے کی بہت سی مقدار ملے تو ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر زیادہ

ہے۔ کیونکہ اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی زیادہ مقدار حاصل ہوتی ،لیکن اگر اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی کم مقدار حاصل ہو،تو ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر کم ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زر نقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیان نسبت معکوس ہے،یعنی اگر زر نقد کی قدر زیادہ ہو تو[3] قیمت اشیاء کم ہوتی ہے اور اگر قیمت اشیاء زیادہ ہو تو زر نقد کی قدر کم ہوتی ہے،لیکن مادی اشیاء کی طرح حقوق (مثلاً کسی شخص سے کوئی خاص رقم وصول کرنے کا حق، وغیرہ) قرضے [4] اور اعتبارات بھی تجارت کے دائرہ میں لائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ الف نے ب سے پانچ سو روپے قرض لیے ہیں۔ ممکن ہے کہ ج الف کو پانچ سو روپے سے کچھ کم رقم ادا کر کے اس سے حق وصولی قرضہ خرید لے اور میعاد مقررہ کے بعد یا عندالطلب ب سے پانچ سو روپے وصول کرلے لہٰذا ان حقوق اور اعتبارات کی خرید وفروخت کے لیے بھی ویسا ہی پیمانہ مقرر ہے جیسا مادی اشیاء کی خرید وفروخت کے لیے۔ جیسے غلہ کے لیے، من کا پیمانہ، کپڑے کے لیے گز کا۔ اسی طرح سہولت کے لیے زر نا مسکوک کو بھی مختلف پیمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کو سکے کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس قرضوں اور اعتبارات کی خرید و فروخت کے لیے بھی ایک پیمانہ مقرر ہے۔ یعنی مبلغ سو روپے وصول کرنے کا حق جو اسے ایک سال بعد واجب الادا ہوگا۔ زر نقد کی وہ مقدار جو کسی قرض کا ایک پیمانہ خریدنے کے لیے ادا کی جائے اس پیمانے کی قیمت نقد کہلاتی ہے اور اس کی خرید وفروخت کا بھی وہی حال ہے جو اور اشیاء کا۔ یعنی ایک پیمانہ قرض خریدکرنے کے لیے زر نقد کی مقدار یا قیمت نقد جس قدر کم ادا کرنی پڑے گی اسی قدر زر نقد کی قدر زیادہ ہوگی اور جس قدر زیادہ دینی پڑے گی اسی قدر اس کی قدر کم ہوگی۔ غرض کہ قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید وفروخت میں بھی مندرجہ بالا اصول ہی صحیح ہے۔ یعنی زر نقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیانی نسبت معکوس ہے،لیکن یادرکھنا چاہیے کہ قرضوں کی خرید وفروخت کسی صورت میں معمولات زر نقد کی قدر کا اندازہ قرضے کی اس مقدار سے نہیں کیا جاتا جو اس کے عوض میں خریدی جاسکے چونکہ زر نقد قدرتاً منافع پیدا کرتا ہے، اس واسطے ظاہر ہے کہ کسی ایسے قرضے کی قیمت نقد جو اب سے ایک سال بعد واجب الادا ہوگا، اس قرضے کی اصل مقدار سے کم ہونی چاہیے۔ ورنہ خریدنے والے کو فائدہ ہی کیا ہوگا۔ پس زر نقد کی قدر موجودہ یا قیمت نقد منفی اصل زر یا مقدار قرضہ

برابر اس منافع کے ہے جو اس قرضے کے خریدنے سے ہوتا ہے۔ اس فرق کو مٹی کاٹا[5] کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جس قدر کسی قرضے کی قیمت نقد بڑھتی یا کم ہوتی ہے اسی قدر مٹی کاٹا بھی کم ہوتا یا بڑھتا ہے۔ لہٰذا قرضوں کی خرید وفروخت کے متعلق یہ اصول قائم ہوا کہ زر نقد کی قدر اور مٹی کاٹے کے درمیان نسبت مستقیم ہے، یعنی قیمت نقد کم ہو تو مٹی کاٹا زیادہ ہوگا اور اگر قیمت نقد زیادہ ہو تو مٹی کاٹا کم ہوگا۔ پس مندرجہ ذیل اصول تجارت کی سب شاخوں یعنی قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید وفروخت اور اشیاء مادیہ کی خرید وفروخت پر حاوی ہے۔

زر نقد کی قدر قیمت اشیاء کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے اور مٹی کاٹا کے ساتھ نسبت مستقیم۔

اب تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اصطلاح زر نقد کی قدر کے دو مفہوم ہیں۔ اشیاء مادیہ اور حقوق وغیرہ کی خرید وفروخت میں تو اس سے مراد قیمت شے یا حق وغیرہ کی اس مقدار سے ہے جو اس کے عوض میں حاصل کی جا سکے اور قرضوں کی خرید وفروخت میں اس کا مفہوم وہ مٹی کاٹا یا منافع ہے جو کسی شخص کو کوئی قرضہ خریدنے سے حاصل ہو۔

اس توضیح کے بعد ہم اپنے اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسی سوال کی وجہ سے زر نقد کی بحث تبادلے کی ذیل میں آتی ہے، ورنہ دیگر اشیاء کی طرح اس کا ذکر بھی باب پیدائش دولت میں کیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر دیگر اشیاء کی قدر کی طرح قانون طلب ورسد کے عمل سے متعین ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو دنیا کی تجارت زر نقد کے بل پر ہی چلتی ہے پس جس قدر استعمال زر نقد کے مواقع زیادہ ہوں گے اسی قدر اس کی مانگ یا طلب بھی زیادہ ہوگی۔ ہاں جب زر نقد کا کام اور وسائل سے لیا جائے، مثلاً چیکوں وغیرہ سے، تو اس کی طلب کم ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زر کاغذی کا استعمال زر نقد کے مواقع استعمال کو کم کرتا ہے۔ کہیں اس غلطی میں نہ پڑ جانا کہ زر نقد کی مانگ یا طلب کا انحصار کسی قوم کی دولت یا اس کی سالانہ پیداوار دولت کی مقدار پر ہے کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قسم کی دولت تجارت کے دائرے میں آئے۔ علیٰ ہذا القیاس اشیاء متبادلہ کی مقدار کو بھی اس مانگ سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ کیونکہ بعض اشیاء کا تبادلہ صرف ایک ہی دفعہ ہوتا ہے، اور بعض کا کئی کئی دفعہ ہوتا ہے۔ مزید برآں خصوصاً زراعتی ملکوں میں بسا اوقات افراد اپنا کام زر نقد کی وساطت کے بغیر مبادلہ

اشیاء[6] سے ہی چلا لیتے ہیں۔ تم شاید یہ کہو گے کہ جب کسی ملک کا سکہ کھوٹا ہو کر یا کسی اور وجہ سے کم حیثیت ہو کر اپنا اعتبار کھو بیٹھتا ہے تو وہاں کے لوگ اس سکے سے احتراز کرنے کی خاطر مبادلہ اشیاء سے کام چلا لیتے ہیں یا ضرورت کی اشیاء ایک دوسرے سے بدل کر سکوں کے استعمال سے بچ جاتے ہیں۔ یہ خیال صحیح ہے مگر کسی ملک میں یہاں تک نوبت نہیں پہنچ سکتی کہ زرنقد کا استعمال بالکل جاتا رہے۔ ہر ملک میں، بشرطیکہ وہاں کے لوگ وحشی نہ ہوں، کچھ نہ کچھ بطور زرنقد کے ضرور مستعمل ہوتا ہے۔ پس زرنقد کی طلب کسی قوم کی دولت یا اس کی پیداوار اور دولت یا اشیاء متبادلہ کی مقدار سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس کا انحصار زرنقد کے مواقع استعمال پر ہے، جو خود مختلف ممالک کی تنظیم، محنت اور دیگر حالات پر منحصر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ زرنقد کی مانگ یا طلب محض خیالی امر ہی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ تم دیکھتے ہو، لوگ روپے کے عوض میں اپنی اشیاء فروخت کرتے ہیں۔ چیزیں دیتے ہیں اور ان کے عوض میں زرنقد قبول کرتے ہیں۔ رسد اشیاء کی ایک معین مقدار کی صورت میں جس قدر زیادہ اشیاء زرنقد کے عوض میں ملیں گی اسی قدر زرنقد کی قدر زیادہ ہوگی یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں کم ہوں گی اور جس قدر کم اشیاء زرنقد کے عوض میں ملیں گی، اسی قدر زرنقد کی قدر کم ہوگی یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہو جائیں۔

زرنقد کی رسد گویا ایک قسم کی قوت ہے جو زرنقد کے تجارتی مقاصد کو پورا کرتی ہے اور جو اس کی مقدار اور سرعت انتقال[7] سے متاثر ہوتی ہے۔ جس قدر زرنقد کی مقدار زیادہ ہوگی اور جس قدر عجلت سے یہ مقدار دست بدست پھر سکے گی، اسی قدر تجارتی مقاصد باحسن وجوہ اتمام پائیں گے۔ اگر زرنقد کی رسد کم ہو جائے تو اشیاء کی قیمتیں کم ہو جائیں گی کیونکہ رسد کی کمی سے زرنقد کی قدر بڑھ جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر رسد زیادہ ہو جائے تو اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہو جائیں گی کیونکہ اس صورت میں زرنقد کی قدر کم ہو جائے گی اور اس کے عوض میں اشیاء کی زیادہ مقدار ہاتھ لگے گی۔

اب ہم زرنقد کے متعلق ایک اور ضروری امر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان زرنقد کی مساوی تقسیم کس طرح ہوتی ہے؟ زرنقد خود بخود ایک ملک سے دیگر ممالک میں منتقل ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کی تقسیم مساوی طور پر ہو جاتی ہے۔ فرض کرو کہ کسی ملک (الف) میں زرنقد کی مقدار وہاں کے لوگوں کی ضرورتوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں گی کیونکہ زرنقد کی زیادتی سے اس کی قدر کم ہو جائے گی۔ اس صورت میں ب اپنی

اشیاء ملک الف میں بھیجے گا۔ کیونکہ وہاں قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے فائدے کی توقع ہے۔ اس طریق سے زر نقد ملک الف سے ملک ب کی طرف منتقل ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ دونوں ملکوں میں اس کی مقدار مساوی ہو جائے گی، لیکن ملک الف میں زر نقد کی افراط کی وجہ سے ایک اور نتیجہ بھی پیدا ہوگا یعنی چونکہ اس کی قدر افراط کے سبب سے کم ہوگی۔ اس واسطے عام لوگوں کو زر نقد کے جمع کرنے کی تحریک ہو گی۔ مختلف اقسام کی صنعتوں میں چاندی یا سونے کا استعمال (جیسی صورت ہو) بڑھتا جائے گا۔ چاندی کے گلاس، حقوں کی منہالیں وغیرہ عام ہو جائیں گی۔ مزید برآں وہاں کے لوگ سکوں کو پگھلا کر زرنا مسکوک کی صورت میں ان ممالک کی طرف بھیجنا شروع کر دیں گے جہاں سونے چاندی کی قدر زیادہ ہے۔ ایسے حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرضاً ملک الف میں کھرے سکے کے ساتھ ایک کھوٹا یا کم وزن کا سکہ بھی جاری ہو (تم جانتے ہو مختلف ممالک کے سکوں میں کم و بیش اختلاف ہوتا ہے۔ اکثر سکے استعمال سے ہلکے ہو جاتے ہیں۔) تو ان دونوں میں سے کس سکے کو جمع کرنے یا پگھلانے یا دیگر ممالک میں بھیجنے کی تحریک ہوگی؟ چونکہ اس ملک میں زر نقد کی افراط ہم نے فرض کر لی ہے اس واسطے ظاہر ہے کہ جو سکہ کھرا یا پورے وزن کا ہوگا لوگ اسی کو جمع کریں گے، یا پگھلا کر دیگر ممالک میں بھیجیں گے۔ کھوٹے یا کم وزن سکوں کی نسبت خالص اور پورے وزن کے سکوں کا جمع کرنا یا دیگر ممالک کو بھیجنا زیادہ فائدہ مند ہوگا کیونکہ دیگر ممالک میں سکوں کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہوتی ہے جو ان میں شامل ہو۔ اسی صداقت کو گریشم صاحب ایک اقتصادی اصول کی صورت میں یوں پیش کرتے ہیں کہ کھوٹا یا ہلکا سکہ کھرے سکے کو دائرہ استعمال سے خارج کر دیتا ہے، اور خود اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اصول اسی صورت میں صادق آئے گا جبکہ کسی ملک میں زر نقد کی مقدار لوگوں کی ضروریات سے زیادہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہلکے یا کھوٹے سکوں اور کھرے سکوں کی قوت خرید میں کوئی فرق نہ ہوگا۔ یہ کلیہ اصول مندرجہ ذیل حالات پر صادق آتا ہے۔

(ا) اگر کسی ملک میں صرف ایک دھات سونے یا چاندی کا کھرا سکہ متداول ہو اور اس کے ساتھ کوئی مغشوش کھوٹا یا ہلکا سکہ بھی متداول رہنے دیا جائے، تو کچھ عرصے میں کھرے سکے کی تمام مقدار دائرہ استعمال سے خارج ہو جائے گی اور صرف کھوٹا سکہ ہی استعمال میں رہے گا۔ کھرے سکے کو یا تو لوگ جمع کرتے جائیں گا یا پگھلا کر رکھتے جائیں گے یا دیگر ممالک سے اشیاء ضرورت کے خریدنے

میں صرف کرتے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی ملک میں گز کے دو پیمانے جاری ہوں ایک تین فٹ اور ایک دو فٹ کا تو کپڑے کے دکاندار قدرتاً دو فٹ والے پیمانے کے حساب سے اپنا کپڑا فروخت کریں گے۔ یعنی دو فٹ والا گز تین فٹ والے گز کو دائرہ استعمال سے خارج کر دے گا۔

(ب) اگر کسی ایک ملک میں دو مختلف دھاتوں مثلاً سونے اور چاندی کے سکے ایک غیر محدود مقدار میں اکٹھے متداول ہوں اور قانونی طور پر ان کے درمیان ایک ایسی نسبت مقرر کر دی جائے جو ان کی حقیقی قدروں کی درمیانی نسبت سے مختلف ہو (یعنی کم یا زیادہ ہو) تو جس سکے کی قدر اس کی حقیقی قدر سے کم ہوگی وہ دائرہ استعمال سے خارج ہو جائے گا اور جس کی زیادہ ہوگی وہی متداول رہے گا۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ ایک ملک میں دو سکے غیر محدود مقدار میں متداول ہیں ایک سونے کی مہر اور دوسرا چاندی کا روپیہ اور ان کی اضافی قدر اس طرح پر ہے کہ ایک مہر مساوی بیس روپے کے ہے۔ نیز فرض کرو کہ مہر کی قانونی قدر بیس روپے ہے یا بالفاظ دیگر بیس روپے کو چلتی ہے، لیکن اس میں سونا اٹھارہ روپیہ کا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس چاندی کے روپے کی قانونی قدر اس کی حقیقی قدر سے کم ہے تو اس صورت میں اصول مندرجہ بالا کی رو سے روپیہ کا سکہ دائرہ استعمال سے خارج ہو جائے گا اور صرف مہر متداول رہے گی۔ لوگ اپنی خرید و فروخت اور قرضوں کی ادائیگی قدرتاً مہر کی وساطت سے کریں گے کیونکہ اس کی اصل قدر تو اٹھارہ روپیہ ہے اور کام بیس روپے کا دیتی ہے۔ چاندی کے سکوں کو لوگ پگھلا کر زر نا مسکوک کی صورت میں جمع کریں گے یا دیگر ممالک میں بھیجیں گے۔ کیونکہ ان کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہوگی جو ان میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۷۶۶ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں چاندی کے سکے کے ساتھ سونے کا سکہ بھی جاری کیا تو اس کارروائی میں ناکامیابی ہوئی اور سکہ مذکورہ چل نہ سکا۔ کیونکہ کمپنی کی مہر کی قانونی قدر چودہ روپیہ کے برابر مقرر کی گئی تھی، جو اس کی حقیقی قدر سے بہت کم تھی۔ ۱۷۶۹ء میں کمپنی مذکور نے پھر ایک طلائی مہر جاری کی، لیکن پھر ناکامی ہوئی آخرکار یہ فیصلہ ہوا کہ بنگال میں صرف ایک ہی دھات کا سکہ متداول رہنا چاہیے۔ اور اس غرض کے لیے چاندی انتخاب کی گئی۔ اب کچھ عرصہ سے سرکار ہند نے اس ملک میں سونے کا سکہ بھی متداول کر دیا ہے، جس کی وجہ ابھی معلوم ہوگی۔

(ج) مندرجہ بالا دو مقدمات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک ملک میں سونے کا سکہ متداول

ہو اور دوسرے میں چاندی کا، تو ان کے درمیان ایک ہی نسبت تبادلہ قائم نہیں رہ سکتی بلکہ چاندی اور سونے کی قیمت کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ سکے خواہ سونے کے ہوں، خواہ چاندی کے ہوں، خارجی ممالک میں اپنی حقیقی قدر کے لحاظ سے قبول کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے روپے کی حقیقی قدر صرف ۱۱ آنے کے برابر ہے۔ اگرچہ قانوناً اس کی قدر ۱۶ آنے کے برابر مقرر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں تو ہر شخص اسے ۱۶ آنے کے عوض میں قبول کرے گا لیکن کوئی وجہ نہیں کہ دیگر ممالک کے لوگ بھی اس کے عوض میں ۱۶ آنے ہی دیں۔ وہ اس کے بدلے اس کی حقیقی قدر یعنی ۱۱ آنے ہی ادا کریں گے۔

یہ کلیہ اصول جو ہم نے بیان کیا ہے۔ علم الاقتصاد کی کتابوں میں قانون گریشم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے نتائج بڑے اہم ہیں اور یہ ایک بڑی ضروری اقتصادی بحث میں کام آتا ہے۔ محققین کے درمیان یہ بحث مدت سے چلی آتی ہے کہ آیا تمام دنیا کے ممالک کو یا کسی ایک ملک کو ایک ہی دھات کا سکہ بطور معیار قدر کے متداول رکھنا چاہیے یا اقتصادی لحاظ سے دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیار قدر کے اکٹھے متداول رہ سکتے ہیں۔ ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ تمام ممالک یا کسی ایک ملک میں اصل معیار قدر تو ایک ہی رہنا چاہیے، جس سے سرکار اور تجارت کے بڑے بڑے معاملے طے ہوا کریں، لیکن روز کی معمولی چھوٹی چھوٹی خرید و فروخت کے لیے اور دھاتوں کے سکے متداول رہنے چاہئیں (8)۔ دوسرا فریق یہ کہتا ہے کہ دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیار قدر کے متداول رہ سکتے ہیں، اور رہنے چاہئیں۔

اس طریق عمل میں اقتصادی لحاظ سے کوئی نقصان نہیں ہے بشرطیکہ مختلف ممالک اتفاق کر کے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان ایک خاص نسبت مقرر کر دیں۔ اس طویل مگر ضروری بحث کو ہم یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے، لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ قانون مذکور بالا کی رو سے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان کوئی نسبت مقرر نہیں رہ سکتی بلکہ چاندی اور سونے کی قدروں کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے۔ تم شاید یہ کہو گے کہ سرکار ہند نے اس صحیح اصول کے خلاف کیوں عمل کیا ہے؟ یعنی ہندوستان میں کیوں دو معیار قدر جاری ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سونے کا سکہ عام استعمال کے لیے نہیں ہے، ہم پہلے اشارتاً ذکر کر آئے ہیں کہ ہمیں انگلستان کو جو رقم سالانہ ادا کرنی پڑتی ہے، وہ پونڈوں کے حساب سے دینی ہوتی ہے۔ اس واسطے جب چاندی کی قدر میں کسی باعث سے کمی ہو جاتی

تھی (بالعموم سونے کی نسبت چاندی کی قدر میں زیادہ تغیر آتے ہیں) تو ہمارے ملک کی مالگزاری کو نقصان پہنچتا تھا۔ کیونکہ جہاں پہلے ایک پونڈ کے عوض میں دس روپیہ دینے پڑتے تھے، چاندی کی قدر کے کم ہو جانے کی وجہ سے ایک پونڈ کے عوض ۱۵ روپیہ دینے پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے تاجروں کو بھی نقصان پہنچتا تھا۔ اسی وقت کو محسوس کر کے ہماری سرکار نے یہاں بھی سونے کا سکہ جاری کردیا ہے چونکہ یہ سکہ عام طور پر مستعمل نہیں ہے اور ہو ہی کس طرح سکتا ہے؟ کیونکہ اس ملک کے لوگ اس قدر غریب ہیں کہ یہاں کوڑیاں بھی بطور سکے کے مستعمل ہوتی ہیں اس واسطے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کہ ہمارے ملک میں ایک ہی معیار قدر یعنی چاندی کا روپیہ جاری ہے۔ اس طریق عمل سے ہم ان نقصانات سے جو ایک ہی معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں مامون ہیں، لیکن وہ بڑے بڑے فوائد جو دو معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں ہمیں حاصل ہیں۔

(۳) تیسرا مقصد زر نقد کا یہ ہے کہ نقد مذکور ادائیگی غیر موجل کا معیار [9] ہے۔ فرض کرو کہ الف اور ب نے آپس میں ایک معاہدہ کیا ہے۔ الف نے ب کو کسی قسم کا سامان دیا ہے، اور ب اس کے عوض میں معاہدہ کرتا ہے کہ بیس سال کے بعد دس ہزار روپیہ اس سامان کے عوض میں ادا کرے گا۔ فرض کرو کہ اس عرصہ میں روپیہ کی قدر میں ایک بہت بڑا تغیر آ گیا ہے، یعنی جو چیز معاہدہ کے وقت آٹھ آنے کو بکتی تھی، اب ایک روپیہ کو ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ قرض کی ادائیگی میں الف گھاٹے میں رہے گا۔ اور ب بہت فائدہ میں۔ اس قسم کی اور صورتوں کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ معیار قدر کوئی ایسی شے ہونی چاہیے جس کی قدر میں تغیر نہ آتا ہو۔ یا کمی بیشی نہ ہوتی ہو۔ ایسی شے تو شاید دنیا بھر میں کوئی نہ ملے۔ ہاں بعض اشیاء کی قدر میں دیگر اشیاء کی نسبت کم تغیر آتا ہے۔ انہیں میں سے سونا اور چاندی دو دھاتیں ہیں جو بالعموم اپنی قدر میں یکساں رہتی ہیں۔ اگرچہ بعض دفعہ ان کی قدر میں بھی تغیر ہو جانے سے دقتوں کا سامنا ہوا ہے۔ تاہم نسبتاً ان کی قدر تغیر سے آزاد رہتی ہے۔ لہٰذا یہ ان قرضوں کی ادائیگی کی صورت میں بھی کام دے سکتی ہیں جن میں مدت کو دخل ہے۔ بعض محققین ان مشکلات سے بچنے کے لیے' جو زر نقد کی قدر کے تغیر سے پیدا ہوتی ہیں' یہ تجویز کرتے ہیں کہ ادائیگی غیر معجّل یا ایسی ادائیگی کی صورت میں جس میں مدت کو دخل ہے، معیار قدر غلہ کو قرار دینا چاہیے۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ عام لوگوں

کو سونے چاندی کے ساتھ ایک خاص قسم کا انس اور دل بستگی پیدا ہو گئی ہے، جس کا دور کرنا مشکلات سے ہے۔ بعضوں نے ان مشکلات سے بچنے کی اور تجاویز بھی پیش کی ہیں، جن کا اس کتاب میں بیان کرنا کچھ ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

حوالہ جات:-

(1) اعتبار یا ساکھ انگریزی اصطلاح Credit کا ترجمہ ہے۔ آج کل "اعتبار" زیادہ مستعمل ہے۔(مرتب)

(2) نقد قانونی Legal Tender جدید اہل قلم اس کے لیے "زر قانونی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ (مرتب)

(3) یہاں "تو" لکھے جانے سے رہ گیا تھا، اس لیے اس کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔(مرتب)

(4) (حاشیہ از مصنف) یاد رکھنا چاہیے کہ قرض سے مراد کوئی خاص رقم یا زر نقد کی مقدار نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں بلکہ علمی لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم وہ حق طلب ہے، جو قرض خواہ کو حاصل ہے یا وہ فرض ادائگی ہے جو مقروض کے ذمے ہے۔ لہٰذا قرضوں کی خرید و فروخت سے مراد قرض خواہ یا مقروض کے حق طلب یا فرض ادائگی کی خرید و فروخت سے ہے۔

(5) مراد ہے Discount جس کے لیے جدید اصطلاح "کٹوتی" ہے۔(مرتب)

(6) Barter۔(مرتب)

(7) مراد ہے Velocity of Circulation۔(مرتب)

(8) (حاشیہ مصنف) یاد رکھنا چاہیے کہ کسی ملک میں دو یا دو سے زیادہ مختلف دھاتوں کے سکوں کا متداول ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ سب سکے بطور معیار قدر کے مستعمل ہوتے ہیں۔ یہ تمام سکے معیار قدر اسی صورت میں سمجھے جائیں گے جہاں رعایا کو یہ حق حاصل ہو کہ جب چاہے کسی دھات کی کچھ مقدار دے کر سرکاری ٹکسال سے متداول سکے بنوا لے۔

(9) Standard of Deferred payment (مرتب)

باب چہارم

حق الضرب[1]

اس باب میں ہم ایک ایسے سوال پر بحث کرنا چاہتے ہیں جس کا فیصلہ گزشتہ اقتصادی اصولوں پر انحصار رکھتا ہے، لیکن مبتدی کو خبردار رہنا چاہیے کہ یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے اور اس کا پورا مفہوم سمجھنے میں بڑے بڑے غلط استدلالات سے کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس خارستان میں قدم رکھنے سے پیشتر اپنا دامن سنبھال لینا چاہیے اور ان تمام گڑھوں سے واقف ہو جانا چاہیے جنھوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجربہ کار منطقیوں اور مصنفوں کو منہ کے بل گرا دیا ہے۔ ایک محقق تحریر فرماتے ہیں کہ جو مصنف زرنقد کے خطرناک مضمون کو چھوتا ہے، وہ ہر لحظہ معرض خطر میں ہے، کیونکہ استدلالی اغلاط شیر اور چیتوں کی طرح اس کے گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اس اندیشہ کو مدنظر رکھ کر ہم اس بحث کو ایک اقتصادی اصطلاح کی تشریح سے شروع کرتے ہیں کیونکہ اس دقیق مضمون کی تفہیم کے لیے یہی راہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتی ہے۔ مبتدی کو لازم ہے کہ ہر جملے اور اصطلاح کے معانی کامل طور پر ذہن نشین کرتا جائے ورنہ وہ اس اہم اقتصادی بحث کی غرض و غایت اور اس کے نتائج سے پوری آگاہی حاصل نہ کر سکے گا۔

ہر ملک میں یہ امر قانونی طور پر فیصلہ پاتا ہے کہ زرنا مسکوک یا سونے، چاندی کی کسی خاص مقدار کے کس قدر سکے گھڑے جائیں۔ مثلاً انگلستان کے موجودہ قانون کی رو سے ۴۰ پونڈ سونے کے ۱۸۶۹ سکے بنائے جاتے ہیں، جو ساورن[2] کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ سکوں کی یہ تعداد جن میں زرنا مسکوک کی کوئی مقدار قانوناً منقسم کی جاتی ہے، اس مقدار کی قیمت ضربی[3] کہلاتی ہے۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ جب تک کوئی سکہ قانونی لحاظ سے پورے وزن کا ہو اس کی قدر ہمیشہ اپنے ہم وزن زرنا مسکوک کی قدر کے مساوی ہوتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ کچھ عرصہ کے روزمرہ استعمال سے سکوں

کا وزن قانونی وزن سے کم ہو جاتا ہے۔ بالعموم خرید وفروخت میں لوگوں کو اس امر کی پروانہیں ہوتی کہ کوئی سکہ وزن کا پورا ہے یا کم ہے۔ اس واسطے ممکن ہے کہ بہت عرصہ تک متداول رہنے سے بعض سکوں کا وزن قانونی وزن سے کم ہو جائے اور بیع وشریٰ میں ان کی قدر وہی تصور کی جائے جو قانوناً مقرر ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی سکے میں ۱۶ آنے کی چاندی ہے، اور ۱۶ آنے کو ہی چلتا ہے۔ ممکن ہے کہ کثرت استعمال سے اس کا وزن کم ہو جائے، یعنی اس کی چاندی پندرہ آنے کی رہ جائے، لیکن بیع وشریٰ میں ۱۶ آنے کو ہی چلتا رہے۔ عام خرید وفروخت میں سکوں کے وزن کی کمی کچھ اثر نہیں کرتی، لیکن جب ان کا تبادلہ زر نا مسکوک سے کیا جائے تو یہ اثر ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں زر نا مسکوک اسی قدر ملے گی جس قدر سکوں کا موجودہ وزن ہے۔ اگر کثرت استعمال سے ان کا وزن قانونی وزن سے کم ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ زر نا مسکوک کی کوئی خاص مقدار تبادلے میں لینے کے لیے سکوں کی زیادہ تعداد دینی پڑے گی۔ پس متداول سکوں کی وہ تعداد جو حقیقی طور پر زر نا مسکوک کی کسی مقدار کے ہم وزن ہے، مقدار مذکور کی قیمت متعارف [4] کہلاتی ہے اور چونکہ کمی وزن کی صورت میں زر نا مسکوک کی کسی مقدار کے عوض میں متداول سکوں کی زیادہ تعداد دینی پڑتی ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ قیمت متعارف قیمت ضربی سے زیادہ ہو گی۔ مثلاً فرض کرو کہ چاندی کی قیمت ضربی پانچ شلنگ دو پنس فی اونس ہے اور قیمت متعارف چھ شلنگ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ سکہ متداول کے چھ شلنگ زر نا مسکوک کی مقدار کے ہم وزن ہیں، جس کا ہم وزن پانچ شلنگ ۲ پنس کو ہونا چاہیے تھا۔ اگر ان کا وزن کثرت استعمال کے باعث قانونی وزن سے کم نہ ہو جاتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ زر نا مسکوک کی قیمت متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جانا سکے کی کم قدر ہو جانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس توضیح سے سکہ زنی [5] کے متعلق دو ضروری اصول پیدا ہوتے ہیں۔

(ا) جب زر نا مسکوک کی قیمت متعارف اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جاتی ہے، تو اس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ سکے کی قدر کم ہو گئی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کہ مذکور کی قدر کہاں تک کم ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ (زر نا مسکوک کی قیمت متعارف - زر نا مسکوک کی قیمت ضربی)= اس وزن کی ہے جو سکہ متداول کی کثرت استعمال سے زائل ہو گیا ہے۔

(ب) قیمت ضربی کی تعریف سے مندرجہ ذیل اصول بطور نتیجے کے پیدا ہوتا ہے۔

زر نا مسکوک کی قیمت ضربی کا بدلنا حقیقت میں سکوں کے قانونی وزن کا بدلنا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ زر نا مسکوک کی قیمت ضربی مختلف حالات میں مختلف ہو سکتی ہے تو یہ صریحاً غلط ہے۔ کیا اگر ایک من شراب کو جو کسی مٹکی میں رکھی ہو، بہت سی بوتلوں میں ڈال دیا جائے تو شراب کی مقدار بدل جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ بہت سے حصوں میں منقسم ہو جانے سے اس کی مقدار میں فرق نہیں آ سکتا۔

اس تشریح کے بعد اب ہم اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تم کو شاید معلوم ہے کہ سرکار سکہ زنی کے متعلق ایک خاص قسم کا حق رکھتی ہے، جس کو حق الضرب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس حق سے مراد زر نا مسکوک کی اس مقدار سے ہے، جو سرکار بطور مصارف سکہ زنی کے لیتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک روپے کے مصارف سکہ زنی ۲ آنے ہیں۔ سرکاری ٹکسال ۲ آنے وضع کرنے کی خاطر روپے میں چودہ آنہ کی چاندی ڈال کر اپنے مصارف سکہ زنی نکال لے گی مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حق الضرب دو قسم کا ہوتا ہے۔

(۱) جب کہ حق الضرب مصارف سکہ زنی کے برابر ہو۔ اس صورت میں سرکار کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس قدر سرکار کا خرچ ہوتا ہے۔ اسی قدر اسے ملتا ہے[6]۔ بعض ممالک میں حق الضرب بالکل نہیں لیا جاتا۔ مثلاً انگلستان کی ٹکسال پونڈ میں پورے بیس شلنگ کی قیمت کا سونا ڈالتی ہے۔ بعض ممالک میں رعایا کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ حق الضرب ادا کر کے یا اس کے بغیر جیسا قانون ہو سرکاری ٹکسال سے اپنے سونے یا چاندی کے ٹکڑے سکوں کی صورت میں منتقل کروا لے۔ چنانچہ انگلستان میں سونے کے سکوں کے متعلق رعایا کو یہ حق حاصل ہے کہ بغیر حق الضرب ادا کرنے کے سونے کے ٹکڑوں کو ٹکسال سے پونڈوں کی صورت میں منتقل کروالیں۔ ۱۸۹۴ء سے پہلے ہندوستان کی رعایا کو بھی یہ حق حاصل تھا۔ اب کسی خاص مصلحت کی وجہ سے جس کا ذکر ابھی آئے گا اس ملک کی ٹکسال رعایا کے لیے بند ہے اور سرکار صرف اسی قدر سکے بناتی ہے، جس قدر اس ملک کی ضرورت کے لیے کافی ہو۔

(۲) جبکہ حق ضرب مصارف سکہ زنی سے زیادہ ہو۔ اس صورت میں سرکار سکہ زنی سے فائدہ اٹھاتی ہے[7]۔ مثلاً ہمارے ہندوستان میں روپیہ ۱۶ آنے پر چلتا ہے حالانکہ اس میں چاندی صرف ۱۱ آنے کی ہوتی ہے۔ گویا سرکار کو فی روپیہ ۵ آنے فائدہ ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک پیسے میں تانبا شاید سات کوڑی کا بھی نہ ہوتا ہو۔ ہم ان دونوں طریقوں پر

بالترتیب بحث کریں گے۔

اول صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی سکے کی قدر زر نا مسکوک کی اس مقدار کی قدر کے مساوی ہونی چاہیے جو اس سکے میں شامل ہے، یا مقدار مذکور کی قدر میں مصارف سکہ زنی بھی شامل ہونے چاہیے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر ایک روپے کے مصارف سکہ زنی ۲ آنے ہوں تو کیا روپے میں ۱۴ آنے کی چاندی ڈال کر اس کی قدر ۱۶ آنے کے برابر مقرر کرنی چاہیے یا ۱۶ آنے کی چاندی ڈال کر اس کی قدر ۱۶ آنے کے برابر ہی مقرر کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں سرکار کو اپنے مصارف سکہ زنی کی بابت میں ۲ آنے مل جائیں گے مگر دوسری صورت میں یعنی جبکہ روپے میں ۱۶ آنے کی چاندی ہو سرکار کو بطور مصارف سکہ زنی کچھ نہ ملے گا۔ یہ ایک بحث طلب معاملہ ہے۔ بعض حکما کہتے ہیں کہ سرکار کو کچھ حق ضرب نہ لینا چاہیے یا یوں کہو کہ ان کے نزدیک مصارف سکہ زنی کی خاطر اس کی حقیقی قدر سے زیادہ قدر پر چلانا اقتصادی لحاظ سے مضر ہے مگر بعض حکما کے نزدیک مصارف سکہ زنی کے برابر حق ضرب لے لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ ان کے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ایک قینچی کی قیمت اس کے ہم وزن لوہے کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس واسطے کوئی وجہ نہیں کہ کسی سکے کی قدر اپنے ہم وزن زر نا مسکوک کی قدر سے زیادہ نہ ہو۔ سونا یا چاندی اپنی نا مسکوک حالت میں اس قدر مفید نہیں ہوتے، جس قدر کہ سکوں کی صورت میں ہوتے ہیں لہٰذا عقل اس امر کی مقتضی ہے کہ جب زر نا مسکوک سکوں کی صورت میں منتقل کر دیا جائے تو اس کی قدر بھی بڑھ جائے گی۔ جیسا کہ لوہے کے ٹکڑے کی قدر ایک زنجیر یا تلوار کی صورت میں منتقل ہو جانے سے بڑھ جاتی ہے۔

(۲) اگر کوئی حق ضرب نہ لیا جائے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر سکے کی قدر زر نا مسکوک کی قدر کے برابر ہو جو اس میں شامل ہے، تو عوام کو جب زر نا مسکوک کی ضرورت لاحق ہو گی سکوں کو پگھلایا کریں گے اور جب سکوں کی ضرورت ہو گی اسی زر نا مسکوک کو سرکاری ٹکسال سے پھر سکوں کی صورت میں منتقل کرا لیا کریں گے۔ یہ عمل بار بار ہوتا رہے گا۔ جس سے سرکار کو بے جا نقصان ہو گا کیونکہ سرکار کو بغیر مصارف سکہ زنی لیے سکے بنانے پڑیں گے۔ یہ دلیل واقعی زبردست ہے مگر باوجود اس بات کے دنیا کے بعض بڑے بڑے تجارتی ملک مثلاً انگلستان وغیرہ حق ضرب نہیں لیتے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی ایک فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب

انگلستان میں سکے کی مقدار تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہو جاتی ہے (تجارتی ملکوں میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے) تو اس افراط کے باعث ان کی قدر کم ہونے نہیں پاتی۔ یا یوں کہو کہ انگلستان میں اشیاء کی قیمتیں زیادہ نہیں ہونے پاتیں کیونکہ سکوں کی یہ غیر ضروری مقدار فوراً دیگر ممالک کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتی ہے اور دیگر ممالک کے لوگوں کو اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا کیونکہ عذر تو اس صورت ہو سکتا ہے جبکہ اس کی قدر اپنے ہم وزن زر نا مسکوک کی قدر سے زیادہ ہو۔ دیگر ممالک کے نزدیک جیسا زر نا مسکوک ویسا انگلستان کا زر مسکوک۔ مثلاً اگر کابل کے سکے میں ۱۰ آنے کی چاندی ہو اور وہ ۱۰ آنے پر ہی چلتا ہو۔ یا یوں کہو کہ کابل حق ضرب نہ لیتا ہو، تو ہندوستان کے لوگوں کو بشرطیکہ ان کو چاندی کی ضرورت ہو، اسے ۱۰ آنے پر خریدنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ غرض کہ انگلستان حق ضرب نہ لینے سے زر نقد کی افراط کے برے نتائج سے بچ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں حق ضرب چونکہ مصارف سکہ زنی سے زیادہ ہوتا ہے اس واسطے سرکار ٹکسال کے اجرا سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اکثر ممالک کے بادشاہوں نے اس طریق عمل سے بے انتہا فائدہ اٹھایا ہے مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس پر کوئی رائے زنی کریں ایک نہایت ضروری اقتصادی اصول کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اشیاء کی قیمت طلب و رسد کی مساوات سے متعین ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ سونا اور چاندی جو اشیاء میں داخل ہیں اس کلیہ قانون کے دائرہ عمل سے خارج ہوں۔ جب سونے چاندی کی مقدار ضرورت سے بڑھ جائے گی تو ان کی قدر ضرور کم ہو گی۔ اور جب ان کی مقدار ضرورت سے کم ہو جائے گی تو ظاہر ہے کہ ان کی قدر زیادہ ہو گی۔ سکے جو سونے اور چاندی سے بنائے جاتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہے کہ افراط کی صورت میں ان کی قدر کم ہوتی ہے اور کمی کی صورت میں ان کی قدر بڑھتی ہے۔
فرض کرو کہ کسی ملک میں زر نقد کی مقدار اس ملک کی تجارتی ضروریات سے بہت کم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں زر نقد کی قدر بہ سبب کمی رسد کے بڑھ جائے گی یا بالفاظ دیگر اشیاء کی قیمت کم ہو جائے گی اور تجارتی کاروبار نہ چل سکے گا، لیکن اگر کسی تدبیر سے زر نقد کی موجودہ مقدار نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو سکے، تو تجارتی کاروبار بلا روک ٹوک چلتے جائیں گے۔ اشیاء کی قیمت اصلی حالت پر عود کر

آئے گی اور مزید زرنقد کی ضرورت لاحق نہ ہوگی۔ پس ایسے ملک کے تجارتی مقاصد آسانی کے ساتھ پورے نہیں ہو سکتے۔ جب تک اس ملک میں زرنقد کی مقدار زیادہ نہ ہو یا کوئی صورت اعتبار کی نہ استعمال کی جائے، یا اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو کسی طرح مقدار موجود میں سرعت انتقال نہ پیدا ہو، کیونکہ سرعت انتقال بھی ایک طرح کی ازدیادی زرنقد ہے جو سکہ پہلے ایک دفعہ استعمال ہوتا تھا ممکن ہے کہ سرعت انتقال کی صورت میں دس دفعہ استعمال ہو۔ یا یوں کہو کہ اس طریق سے ایک سکہ وہی کام کر سکتا ہے جو ازدیادی زرنقد کی صورت میں دس سکوں کی وساطت سے پورا ہوتا۔

گویا زرنقد کی سرعت انتقال کا زیادہ ہونا ایک طرح سے زرنقد کی مقدار کا زیادہ ہونا یا بالفاظ دیگر زرنقد کی قدر کا کم ہونا ہے اور اشیاء کی قیمت کا بڑھنا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس زرنقد کی قدر کی زیادتی اس کی مقدار اور سرعت انتقال اور قیمت اشیاء کی کمی پر دلالت کرتی ہے لہٰذا جب کسی ملک میں زرنقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے کم ہو تو اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ مقدار کو زیادہ کیا جائے یا کسی تدبیر سے زرنقد کی سرعت انتقال زیادہ ہو جائے، لیکن جب کسی ملک میں زرنقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے بہت بڑھ جائے یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں تو اس کا کیا علاج؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ زرنقد کی رسد کو محدود کر دیا جائے۔ سنہ ۱۸۹۳ء سے پہلے ہمارے ملک میں نئی کانوں کے دریافت ہونے اور ٹکسال کے عام طور پر کھلا ہونے سے روپے کی قدر بہت کم ہو کر ۱۳ پنس کے برابر رہ گئی تھی، جس سے ملک میں اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں اور سرکار کی مالگزاری کو نقصان ہونے لگا کیونکہ جو روپیہ ہمیں انگلستان کی پنشنوں، تنخواہوں اور دیگر مصارف حکومت کی بابت دینا پڑتا ہے وہ مالگزاری میں سے ہی ادا کیا جاتا ہے۔ ایک پونڈ کے لیے جہاں پہلے دس روپیہ دینے پڑتے تھے چاندی کی قدر کم ہو جانے کی وجہ سے ۱۶ روپیہ دینے پڑے۔ کیونکہ ہم کو یہ روپیہ سونے کے سکے میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا علاج سرکار ہند نے یہ کیا کہ زرنقد کی رسد محدود کر دی، یعنی ٹکسالیں بند کر دیں۔ آج کل رعایا کو یہ حق حاصل نہیں کہ چاندی کے ٹکڑے دے کر سرکاری ٹکسال سے روپیہ بنوا لے بلکہ سرکار ملک کی تجارتی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر خود روپیہ بناتی ہے۔ اس تجویز کی اگرچہ اس وقت مخالفت کی گئی تھی، لیکن اس کی عمدگی اس کے اثر سے ظاہر ہے، یعنی ہمارا روپیہ اب ۱۳ پنس کی جگہ ۱۶ پنس کے برابر ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شے معیار قدر مقرر کی جائے اس کی قدر کا متغیر ہو جانا تمام تجارتی انتظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

غرض کہ مندرجہ بالا توضیح سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ زر نقد کی قدر اس کی رسد کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ رسد زیادہ ہو گی تو اس کی قدر کم ہو گی اور اگر رسد کم ہو گی تو اس کی قدر بڑھے گی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اگر سرکار مصارف سکہ زنی سے زیادہ حق ضرب وصول کرے تو زر نقد کی قوت خرید یعنی قدر پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی ملک کی سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب کیوں نہ لے زر نقد کی قوت خرید وہی رہے گی۔ کیونکہ یہ تو صرف تبادلہ کا ایک ذریعہ ہے۔ جب تک اس کی مقدار کسی ملک کی تجارتی ضرورتوں کے مطابق ہو گی کوئی وجہ نہیں کہ اس کی قدر میں کوئی تغیر آئے۔ لہٰذا نتیجہ ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر کی کمی بیشی اس کی رسد کی کمی بیشی پر موقوف ہے۔ حق ضرب کی کمی بیشی کو زر نقد کی قدر کی کمی بیشی کے ساتھ کوئی ضروری تعلق نہیں۔ اگر روپے میں ۱۱ آنے کی جگہ ۸ آنے کی چاندی ڈالی جائے یا یوں کہو کہ سرکار ہند ۶ آنے کی جگہ ۸ آنے حق ضرب لے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے روپے کی قدر میں کمی پیدا ہو۔ روپیہ بحیثیت ایک وسیلہ تبادلہ ہونے کے بدستور ۱۶ آنے پر چلتا رہے گا۔

یعنی اس باب کی ساری بحث کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کر سکتے ہیں کہ زر نقد کی قدر کی کمی کے دو ضروری اسباب ہیں، جن کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے:۔

اول:۔ زر نا مسکوک کی قیمت متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے زیادہ ہونا، جیسا کہ ابتدا میں لکھا جا چکا ہے۔

دوم:۔ اس کی رسد کا تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہونا ہے۔

تم کہو گے کہ اگر حق ضرب کا زیادہ ہونا اس کی قدر پر کچھ اثر نہیں رکھتا، تو پھر ایسے سکوں کے جاری کرنے میں کیا حرج ہے جن کی قدر ان کی قدر حقیقی سے زیادہ ہو۔ بیشک سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب کیوں نہ لے کوئی نقصان نہیں۔ صرف یہ بات ہے کہ اگر ایسا سکہ کثرت سے جاری کیا جائے تو تجارت بیرونی پر برا اثر ہوتا ہے۔ کیونکہ دیگر ممالک میں ایسے سکوں کی قدر زر نا مسکوک اس مقدار کے لحاظ سے متعین ہو گی جو ان میں شامل ہے۔

حوالہ جات:۔

(1) اس سے مراد وہ معاوضہ ہے جو حکومت سکہ سازی کے مصارف کے سلسلہ میں لیتی ہے اور معاشیات کی اصطلاح میں اسے Cost of Coinage کہتے ہیں۔ (مرتب)

(2) Sovereign

(3) قیمت ضربی سے مراد "قدر حقیقی" یا Intrinsic Value ہے۔ (مرتب)

(4) قیمت متعارف سے مراد Face Value ہے۔ (مرتب)

(5) جدید اہل قلم "سکہ سازی" یا تسکیک (Coinage) کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں۔ (مرتب)

(6) ایسی صورت کو معاشیات کی اصطلاح میں Brassage کہتے ہیں۔ (مرتب)

(7) معاشیات کی فنی زبان میں اسے Seinorage کہا جاتا ہے۔ (مرتب)

باب پنجم

زر کاغذی

باب گزشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ سرکار جس قدر چاہے حق ضرب لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں ہماری سرکار فی الحال فی روپیہ ۵ آنے حق ضرب لیتی ہے، لیکن اقتصادی اصول کی رو سے اگر ۱۵ آنے فی روپیہ بھی حق ضرب لیا جائے تو ملک کی خرید وفروخت کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ روپیہ فی الحقیقت تبادلہ اشیاء کا ایک ذریعہ ہے، جس کی قدر دیگر اشیاء کی طرح رسد اور طلب کی درمیانی مساوات سے متعین ہوتی ہے۔ مختلف ممالک میں حق ضرب کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ بعض جگہ پانچ فیصدی، بعض جگہ دس فیصد۔ لیکن کیا سکے کی کوئی ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے جس میں سرکار کے حق ضرب کی مقدار پوری سو فیصدی ہو؟ بے شک زر کاغذی کے اجرا کی صورت میں سکوں کی وہ تمام مقدار بچ جاتی ہے جو زر مذکور کے عدم اجرا کی صورت میں سرکار کو جاری کرنی پڑتی۔ اگر سرکاری اوراق جو ہمارے ملک میں متداول ہیں جاری نہ کئے جاتے تو ظاہر ہے کہ سرکار کو ان کی جگہ سکہ مذکور متداول کرنا پڑتا، لیکن اس زر کاغذی کی وساطت سے ہماری سرکار اس اجرا سے سبکدوش ہو گئی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ سکے کی اس خاص صورت میں ہماری سرکار نے پورے سو فیصدی حق ضرب لیا ہے۔ زر کاغذی کے پہلے موجد چین کے لوگ ہیں۔ بارہویں صدی میں جبکہ مشہور سیاح مارکو پولو نے ملک چین کا سفر کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک درخت کی چھال کا سکہ جاری ہے جو لین دین میں سونے چاندی کے سکوں کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ تیرہویں اور چودھویں صدی میں فارس اور جاپان کے حکمرانوں نے بھی چین کی تقلید کی لیکن یورپ کی اقوام نے اس کے استعمال کے فوائد صدیوں بعد محسوس کیے۔ زر کاغذی کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) زر کاغذی غیر متبدل[1] جو عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرایا جا سکتا۔

(2) زر کاغذی متبدل[2] یا زر بنک جو عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل کرایا جا سکا ہے۔ مقدم الذکر کی صورت میں یا تو خود اسے سرکار جاری کرتی ہے یا بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی تجارتی یا دیگر حادثے کے باعث کسی ملک میں زر نقد کی مقدار کم ہوگئی ہو تو سرکار حکماً زر بنک کو زر غیر متبدل کی صورت میں منتقل کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں زر بنک کو عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرا سکتے کیونکہ سرکار کے خزانے میں زر نقد ہوتا ہی نہیں جو اس عوض میں دیا جائے۔ سنہ ۱۷۹۷ء اور سنہ ۱۸۲۱ء کے درمیان انگلستان میں اور سنہ ۱۸۴۸ء میں فرانس میں یہی حالت رہی کہ سرکاری بنکوں کے اوراق عندالطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرائے جا سکتے تھے۔ چونکہ زر کاغذی غیر متبدل میں اپنے آپ کو ملک کی حالت[3] اقتصادی کے تغیر کے ساتھ مطابق کرنے کی قابلیت نہیں ہے اس واسطے اس کا اجرا کچھ بہت مفید نہیں ہے۔

بعض حکما کے نزدیک زر کاغذی زر نہیں کہلا سکتا کیونکہ ان کی رائے میں زر نقد کی یہ خاص صورت بحیثیت وسیلہ تبادلہ کے قومی اور تجارتی بہبود کے لیے مضرت رساں ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ دلیل منطقی لحاظ سے بالکل ناقص ہے۔ اسی طرح کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں شراب کے استعمال کو بحیثیت اس کے کہ یہ پینے کی چیز ہے برا سمجھتا ہوں لہٰذا شراب پینے کی چیز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شے زر نقد کے مقاصد کو انجام دیتی ہے وہ زر نقد ہے، خواہ کاغذ ہو خواہ پتھر۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ زر کاغذی زر نقد کی طرح وسیلہ تبادلہ کی حیثیت سے استعمال ہو سکتا ہے اور حقیقتاً اس حیثیت سے مختلف ممالک میں استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے۔ جوں جوں کسی ملک میں پیدائش دولت اور تجارت کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں توں توں ضرورت مجبور کرتی ہے کہ زر نقد کے مقاصد کو سرانجام دینے کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوں۔ ایسے حالات میں جو شے خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ان مقاصد کو پورا کرے گی زر نقد یا زر نقد کی قائم مقام ہوگی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زر کاغذی ہمیشہ اور ہر ملک میں زر نقد ہے۔ بلکہ ہمارا مدعا یہ ہے کہ جب کسی جگہ سکے کی یہ صورت زر نقد کے مقاصد کو پورا کرنا شروع کرتی ہے، اس وقت سے زر نقد بن جاتی ہے اور جب تک ان مقاصد کو پورا کرتی رہتی ہے زر نقد ہی بنی رہتی ہے اور اگر کسی ملک کی سرکار دیوالیہ ہو جائے اور اپنے جاری کردہ اوراق کو قانوناً زر کاغذی غیر متبدل کی صورت میں منتقل نہ کرے تو ظاہر ہے کہ سرکاری اوراق کو خرید و فروخت میں کوئی شخص قبول نہ کرے گا۔ یا یوں کہو کہ

سرکاری اوراق زرنقد نہ رہیں گے۔ اسی بنا پر زرکاغذی بطور معیار قدر بھی مستعمل ہوسکتا ہے کیونکہ جو شے وسیلہ تبادلہ ہوگی ضرور ہے کہ معیار قدر بھی ہو۔ علیٰ ہذا القیاس زرکاغذی ادائیگی غیر معجل کا معیار بھی ہوسکتا ہے کیونکہ بالعموم یہ نقد قانونی ہوتا ہے یعنی قرض خواہ قانوناً اس کے قبول کرنے پر مجبور کیے جا سکتے ہیں بلکہ اگر یہ نقد قانونی نہ بھی ہو تو بھی یہ روزمرہ کے استعمال میں غالباً ادائیگی غیر معجل کا معیار قرار پا جائیں گے کیونکہ ہر شخص اشیاء کی قیمتوں کو زرنقد متداول سے تعبیر کرنے کا ایک زبردست میلان رکھتا ہے۔ لہٰذا زرنقد کی طرح زرکاغذی کی قدر بھی اس کی طلب و رسد پر انحصار رکھتی ہے اور جس طرح ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ حق ضرب اور زرنقد کی قدر کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضرورت تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح سے یہ بھی ثابت ہوسکتا ہے کہ زرکاغذی کے غیر متبدل ہونے اور اس کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضروری رشتہ نہیں۔ اس کی قدر صرف ایسی صورت میں کم ہوسکتی ہے جب اس کی مقدار ان سکوں کی قیمت ضربی سے زیادہ ہو، جو اس کی عدم اجرا کی صورت میں متداول کرنے پڑیں[4]۔ اس کی ارزانی اس کے اجرا کی محرک ہوتی ہے اور اس کے اجرا کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کہ سرکار کو فائدہ اٹھانا مطلوب ہو یا کسی قومی حادثے کے باعث زرنقد کی مقدار کم ہوگئی ہو۔ غرض کہ زرکاغذی زرنقد کے تمام مقاصد کو پورا کر سکتا ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ زرنقد نہ ہو سکے۔ بشرطیکہ اس کی مقدار متداول زائد از ضروریات ملکی نہ ہو۔ اگر اس کی مقدار زائد از ضرورت ہوگی تو اس کی قدر کم ہو جائے گی اور قرض خواہوں کو نقصان ہوگا۔ مقروض فائدے میں رہیں گے، کیونکہ اس کی قوت خرید بسبب کمی قدر دن بدن کم ہوتی جائے گی اور چونکہ یہ ایک ملک سے دوسرے ممالک میں منتقل نہیں ہو سکے گا (کیونکہ دیگر ممالک کے لوگ کم قدر کے[5] سکے کو قبول نہیں کریں گے بلکہ پوری قدر قائم رہنے کی صورت میں بھی اس کا قبول کرنا نہ کرنا ان کے اختیار میں ہے) اس واسطے اس ملک کی تجارت خارجی کو انتہا درجے کا نقصان پہنچے گا۔ جہاں زرکاغذی کی قدر کم ہوگئی ہے۔

زر بنک[6] اس زرکاغذی کا نام ہے جو عندالطلب زرنقد کی صورت میں تبدیل کرایا جا سکتا ہو۔ سرکار یا خود اپنی بنک جاری کرتی ہے یا چند اشخاص جمع ہو کر سرکاری منظوری سے بطور خود بنک جاری کر سکتے ہیں، لیکن دونوں صورتوں میں بنک کا چلنا بنک والوں کے اعتبار یا ساکھ پر منحصر ہے۔ اگر ان کی ساکھ نہ ہوگی تو نہ کوئی شخص ان کے جاری کردہ اوراق کو قبول کرے گا اور نہ ان کی تفریض میں اپنا روپیہ دے گا چونکہ زرکاغذی کے تداول کی بنا ساکھ پر ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ ہر بنک کے پاس زرنقد کی

ایک کافی مقدار موجود ہونی چاہیے تاکہ جس وقت کوئی شخص کسی بنک کے اوراق کو بنک مذکور سے زر نقد کی صورت میں تبدیل کرانا چاہے فوراً کرا سکے۔ اگر ایسا نہ ہوگا تو بنک کی ساکھ جاتی رہے گی۔ لہٰذا ہر بنک اس خوف کو مدنظر رکھ کر زر مسکوک کی ایک خاص مقدار اپنے پاس رکھتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جس قدر زر نقد کسی بنک کے پاس موجود ہے اس سے بہت زیادہ کے اوراق جاری کیے جائیں ورنہ بنک کو کچھ فائدہ نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ بات ساکھ یا اعتبار کے بل پر ہی ہو سکتی ہے بصورت دیگر ممکن نہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنک والے کم شرح سود کے عوض ایک سے روپیہ مستعار لیتے ہیں اور دوسرے کو زیادہ شرح سود کے عوض مستعار دے کر فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنک کبھی روپیہ قرض نہیں دیتا بلکہ ساکھ کے بل پر اپنی موجودہ زر نقد کی مقدار سے زیادہ کے اوراق جاری کر کے یا اعتبار کی اور صورتیں پیدا کر کے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ بنک ایک قسم کی دکان ہے جہاں اعتبار بکتا ہے۔ لوگ اپنا روپیہ' تجارتی ہنڈیاں اور حقوق کی دیگر صورتیں لاتے ہیں اور بنک ان کے عوض میں گویا اپنے اعتبار کی ایک مساوی مقدار دیتا ہے یا یوں کہو کہ وہ اپنے گاہکوں کو یہ حق دیتا ہے کہ جب چاہیں، جہاں چاہیں اپنا روپیہ وصول کر لیں یا یہ حق وصولی کسی اور کو تفویض کر دیں اور بصورت عدم ادائیگی اس پر نالش کر کے وصول کر لیں۔

چونکہ وہ حقوق جو بنک اپنے گاہکوں کو دیتا ہے غیر مادی ہونے کی وجہ سے قابلیت انتقال نہیں رکھتے۔ اس واسطے ضرور ہے کہ اس غرض کے لیے ان کو کاغذ پر تحریر کیا جائے لہٰذا بنک یا تو اپنے اوراق جاری کرتا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ گاہک کو یا ورقہ بنک کے قابض کو کوئی خاص رقم عندالطلب ادا کر دی جائے گی یا گاہک بنک کو اپنا دستی رقعہ لکھ سکتا ہے کہ کوئی خاص رقم عندالطلب فلاں شخص کو ادا کر دی جائے اس قسم کے رقعہ کو چیک کہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جو روپیہ بنک اپنے اعتبار کے عوض میں اوروں سے وصول کرتا ہے وہ امانت نہیں ہے بلکہ بنک کی ملکیت ہے۔ جس کو بنک تجارتی اغراض میں لگا کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس روپے کے بل پر وہ اعتبار کے عوض دیگر حقوق خرید کرتا ہے اور اس کے اعتبار کی مقدار جس کے عوض میں وہ دیگر حقوق خرید کرتا ہے' روپے کی اس مقدار سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جو اس کے پاس موجود ہوتی ہے۔ اعتبار کی اس قدر توسیع ہی اس کے فائدہ کی بنیاد ہے لہٰذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ میرا اس قدر روپیہ بنک میں موجود ہے، وہ اگرچہ محاورہ متعارف کے رو سے صحیح الفاظ استعمال کرتا

ہے تاہم اصول بنک کے لحاظ سے یہ استعمال صحیح نہیں ہے کیونکہ بنک میں جس قدر روپیہ ہے وہ بنک کی ملکیت ہے، نہ ان اشخاص کی جن سے وہ روپیہ لیا گیا ہے۔ البتہ یہ اشخاص ایک مجرد حق کے مالک ہیں، یعنی ان کو یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہیں، جہاں چاہیں، اپنا روپیہ وصول کر لیں۔ پس ظاہر ہے کہ بنک کا سرمایہ اس کا اعتبار ہے۔ وہ اس اعتبار کی وساطت سے روپیہ تجارتی قرضے، حقوق نالش اور دیگر اقسام کے مجرد حقوق بعینہ اس طرح خرید کرتا ہے جس طرح کوئی شے روپے کی وساطت سے خریدی جائے اور اپنے اعتبار کی قیمت بھی اسی طرح وصول کرتا ہے جیسے یہ حقیقت میں زرنقد ہے۔ جس طرح سوداگر اپنی اشیاء کو کم قیمت پر خریدتا ہے اور زیادہ قیمت پر بیچ کر فائدہ اٹھاتا ہے اسی طرح بنک بھی اپنی اشیاء یعنی اعتبارات، قرضے اور حقوق نالشی وغیرہ کو ایک شخص یعنی اپنے گاہک سے خرید کرتا ہے اور ان کو زیادہ قیمت پر اور شخص یعنی مقروض کے پاس فروخت کرتا ہے کیونکہ جس قرض کو بنک خرید کرتا ہے اس کی قیمت دن بدن بڑھ رہی ہے اور بڑھتی رہے گی جب تک کہ وہ ادا نہ ہو جائے۔ چونکہ اس خرید و فروخت سے جس کی بنا اس کے ذاتی اعتبار پر ہے بنک کو منافع ہوتا ہے لہٰذا بنک کا ذاتی اعتبار اس کا سرمایہ ہے جو بنک کی موجودہ زرنقد کی مقدار سے زیادہ ہونے کے باعث ملک کے سرمائے کو بہت زیادہ کر دیتا ہے۔

بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ اگر زر بنک کو زرنقد کی صورت میں تبدیل کرانے میں ہر طرح کی آسانی ہو تو ہر حالت میں ایسا ہی ہوگا جیسا سونے چاندی کے سکے' جن کو یہ تعبیر کرتا ہے۔ گویا زرنقد کی ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا مگر اس غرض کے لیے کہ زر بنک ہر حالت میں ایسا ہی رہے گا جیسا کہ سونے چاندی کے سکے جن کو یہ تعبیر کرتا ہے، ضروری ہے کہ بنکوں کا انتظام نہایت صحیح اصول کے مطابق ہو۔ اس رائے کو علم اقتصاد کی اصطلاح میں اصول بنک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض حکما اس رائے کے مخالف ہیں ان کا یہ خیال ہے کہ اگر ملک کے تمام بنکوں کو یہ اختیار ہو کہ اپنے اپنے سود و زیان کو ملحوظ رکھ کر جس قدر چاہیں اوراق جاری کریں تو ضروریات ملکی سے زیادہ اوراق جاری ہو جانے کا اندیشہ ہوگا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ بنکوں کے اجرائے اوراق پر قانونی قیود ہوں۔ یہ اصول جس کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں اصول تداول سے موسوم کرتے ہیں' اول اول ملک چین میں وضع کیا گیا تھا۔ اسی اصول پر انگلستان میں ۱۸۴۴ء میں بنک ایکٹ پاس ہوا جس کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:-

(۱) بنک انگلستان کو ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ سے زیادہ کے اوراق جاری کرنے کا اختیار نہ ہو گا۔ رقم مذکور سے زیادہ کے اوراق جاری کرنے کے لیے اس کے پاس زر مسکوک کی مقدار موجود ہونی چاہیے۔

(۲) بنک مذکور کا محکمہ اجرائے اوراق اور محکمہ بنک الگ الگ ہوں گے۔

(۳) لنڈن کا کوئی اور بنک یا کوئی ایسا بنک جس کی میعاد ۱۸۴۴ء سے شروع ہوتی ہے اوراق نہیں جاری کر سکے گا۔ ۱۸۴۴ء سے پہلے کے بنک اپنی اوراق کی تعداد اس تعداد سے زیادہ نہیں کر سکیں گے جو سن مذکور میں تھی۔

مذکورہ بالا ہر دو راؤں کے مویدوں کے درمیان ایک طول طویل بحث بڑی سرگرمی کے ساتھ جاری ہے اور چونکہ جانبین کے دلائل ہماری رائے میں ہم وزن معلوم ہوتے ہیں اس واسطے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں کون سی رائے قابل ترجیح ہے۔

حوالہ جات:۔

(1) Incovertible Paper Money۔ جدید اہل قلم اسے "غیر بدل پذیر زر کاغذی" کہتے ہیں۔ (مرتب)

(2) Convertible Paper Money۔ بدل پذیر زر کاغذی (مرتب)

(3) اصل مسودہ میں یہاں "حالات" تھا۔ (مرتب)

(4) یہاں الفاظ بالکل کٹے ہوئے تھے اس لیے سیاق و سباق کی مناسبت سے "کرنے پڑیں" کا اضافہ کر کے انہیں درست کیا گیا ہے۔ (مرتب)

(5) یہاں "کے" لکھنے سے رہ گیا تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(6) (حاشیہ از مصنف) لفظ بنک عام طور پر حال کی عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے اس کی جمع بنوک آتی ہے۔ لہٰذا ترکیب اضافی میں اس کا استعمال خلاف قواعد اردو نہیں ہے۔

باب ششم

اعتبار کی ماہیت ومقاصد اور اس کا اثر اشیاء کی قیمتوں پر

جب کوئی شخص یہ حق رکھتا ہے کہ کسی دوسرے شخص سے عندالطلب یا ایک مقررہ میعاد کے بعد کوئی رقم وصول کرے یا اس سے کوئی خدمت لے تو اس حق کو حق اعتبار [1] کہتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ میں کسی سوداگر سے کوئی شے اس معاہدے پر خریدتا ہوں کہ کسی خاص میعاد کے بعد اس شے کے عوض میں اس قدر رقم ادا کروں گا۔ ظاہر ہے کہ گویا یہ چیز میں نے اپنے اعتبار کی وساطت سے خریدی ہے، اور اس کے عوض سوداگر مذکور کو یہ حق دیا ہے کہ اگر میں مقررہ میعاد کے بعد رقم مذکور ادا نہ کروں تو اسے اختیار ہے کہ قانونی چارہ جوئی کر کے وہ رقم وصول کرلے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر میں کسی ڈاکخانے سے کوئی ٹکٹ والا لفافہ خرید کروں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ مجھے ڈاک خانے پر اعتبار ہے کہ میرا خط فلاں مقام پر پہنچ جائے گا۔ اگر مجھے یہ اعتبار نہ ہوتا تو میں اس لفافے کو ہرگز نہ خریدتا۔ گویا میں نے اپنے پیسوں کے عوض ڈاک خانے کا اعتبار خرید کیا ہے اور ڈاک خانے نے اپنے اعتبار کے عوض میرے پیسے خرید کیے ہیں۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ زمانہ حال کے مہذب ممالک میں اعتبار اور دیگر حقوق بھی بطور سرمایہ مستعمل ہو کر ملک کے سرمائے کو بہت زیادہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بڑے بڑے رفاہ عام کے کام مثلاً ریلوے اور آب رسانی وغیرہ انجام پذیر نہ ہو سکتے۔ کیونکہ ایسے کاموں کے لیے کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے جو بالعموم فرد واحد مہیا نہیں کر سکتا۔ بلکہ چند آدمی مل کر اپنے اعتبار پر اوروں سے روپیہ حاصل کرتے ہیں اور اس مجموعی کوشش سے بڑے بڑے عظیم الشان اور منفعت خیز کام کر کے مزید دولت پیدا کرتے ہیں۔

بعض حکما اس بات پر مصر ہیں کہ کسی شخص کا ذاتی اعتبار اس شخص کی دولت میں داخل نہیں،

لیکن یہ رائے صریحاً غلط ہے۔ ہر شے جو قوت خرید رکھتی ہے دولت ہے اور چونکہ اعتبار کی وساطت سے بھی اشیاء اسی طرح خریدی جا سکتی ہیں جس طرح نقد روپے کی وساطت سے یعنی اعتبار بھی قوت خرید رکھتا ہے اس واسطے صریح نتیجہ یہ ہے کہ اعتبار دولت ہے۔ یہ ایک ایسا قیاس ہے جس سے کسی کو گریز نہیں ہو سکتا[2]۔

اعتبار کی غرض و غایت یا مقصد تجارت کے دائرہ کو وسیع کرنا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ میں ایک کتاب کا حق تصنیف خرید کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جو روپیہ میں نے حق مذکور کے عوض میں دیا ہے وہ اس توقع پر دیا ہے کہ مجھے اس حق کے قبضے سے آئندہ منافع ہوگا۔ اگر یہ توقع نہ ہوتی تو میں ہرگز نہ خرید کرتا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جو روپیہ میں نے دیا ہے وہ اس منافع کی قیمت نقد ہے جو مجھے اس حق کے قبضے سے آئندہ حاصل کرنے کی توقع ہے۔ پس اس توقع یا اعتبار کی بدولت اس منافع کی قیمت نقد بھی تجارت یا خرید و فروخت کے دائرہ میں آ گئی جو ابھی حاصل ہونا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس جب میں کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہوں تو میری غرض یہی ہوتی ہے کہ مجھے منافع ہو۔ اگر مجھے کمپنی مذکور کے حصص کی خرید سے آئندہ منافع کی توقع نہ ہو یا یوں کہو کہ کمپنی مذکور پر اعتبار نہ ہو تو میں کبھی ان حصص کا خریدار نہ ہوں گا۔ اس کمپنی کے اعتبار کی وساطت سے حصص کے آئندہ منافع کی قیمت نقد (یعنی جو روپیہ میں نے حصص کے عوض اب ادا کر دیا ہے) بھی تجارت کے دائرہ میں آ گئی۔ لہٰذا اعتبار کا مقصد منافع مستقبلہ کی قیمت نقد کو تجارت کے دائرہ میں لانا ہے۔ کسی فرانسیسی مصنف نے کیا خوب کہا ہے:-

''کہ انسان مکان کو تجارت کے ذریعہ اور زمان کو اعتبار کے ذریعے فتح کرتا ہے۔''

چونکہ اعتبار اور اس کی مختلف صورتیں یعنی تجارتی ہنڈیاں، چیک اور اوراق بنک وغیرہ زر نقد کے قائم مقام ہیں، اس واسطے تھوک فروشی کی صورت میں ان کا استعمال بالخصوص مفید ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی ہنڈی کئی سوداگروں کے ہاتھوں میں پھر جاتی ہے اور ان کی تجارتی ضروریات کو اس طرح رفع کرتی ہے جس طرح زر نقد، مثلاً فرض کرو کہ ب نے الف سے ہزار روپے کی ہنڈی لی ہے۔ ب اس ہنڈی کی پشت پر دستخط کر کے ج سے ہزار روپے کی اشیاء خرید کر سکتا ہے اور اسی طرح ج اس کی پشت پر دستخط کر کے د سے اشیاء خرید کر سکتا ہے اور یہ عمل متواتر کئی بار ہو سکتا ہے۔ اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ ہنڈی مذکور میں زر نقد کی سی قوت خرید ہے اور اس کا اثر خرید و فروخت پر ایسا ہی ہوتا ہے

جیسا کہ زر نقد کا۔ پس جب تک یہ ہنڈی متداول رہے گی ہزار روپے کے قائم مقام تصور کی جائے گی کیونکہ اگر ہنڈیاں اور اعتبار کی دیگر صورتیں استعمال میں نہ آتیں تو صاف ظاہر ہے کہ خرید و فروخت میں زر نقد کی ضرورت پڑتی۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اشیاء کی قیمتیں زر نقد متداول کی مقدار پر منحصر ہیں۔ اگر اشیاء تجارت کی تعداد وہی رہے اور زر نقد کی مقدار بڑھ جائے تو ظاہر ہے کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اشیائے تجارت کی تعداد بڑھ جائے اور زر نقد متداول کی مقدار بدستور وہی رہے، اور اس میں کوئی مزید سرعت انتقال پیدا نہ ہو، تو اشیاء کی قیمتیں کم ہو جائیں گی۔ کیونکہ زر نقد کی مقدار کی کمی کے باعث اس کی قدر زیادہ ہو جائے گی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے عوض بہت سی اشیاء مل سکیں گی۔ جوں جوں کسی ملک میں اشیاء تجارت کی تعداد بڑھتی جاتی ہے یا یوں کہو کہ خرید و فروخت کے نئے نئے موقعے نکلتے آتے ہیں توں توں زر نقد متداول کی مقدار بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے۔ جن ممالک میں انسانی جان و مال ہر طرح سے محفوظ ہیں وہاں اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اعتبار کی مختلف صورتیں استعمال میں لائی جاتی ہیں کیونکہ ان سے بھی وہی کام نکلتا ہے جو زر نقد کے استعمال سے۔ یا اگر تجارتی ہنڈیاں یا اعتبار کی دیگر صورتیں دائرہ تجارت میں نہ آئیں تو زر نقد متداول کی مقدار کو بڑھانے کی ضرورت پڑتی، ورنہ اشیاء کی قیمتیں بہ سبب زر نقد کی قدر کے زیادہ ہو جانے کے کم ہو جاتیں۔ پس ظاہر ہے کہ وہ خرید و فروخت جو اب ہنڈیوں یا دیگر اعتبار کی صورتوں کی وساطت سے ہوتی ہے، زر نقد کی وساطت سے ہوتی، تو دو نتیجوں میں سے ایک نتیجہ ضرور پیدا ہوتا یا زر نقد کی زیادہ مقدار متداول کرنی پڑتی، یا اشیاء کی قیمتیں کم ہو جاتیں لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہنڈیوں کا اثر جو اشیاء کی قیمتوں پر پڑتا ہے، اس کا باعث یہ نہیں کہ ہنڈی میں کوئی خاص قسم کی خصوصیت ہے۔ ہنڈی یا اعتبار کی اور صورت بذات خود کوئی اثر اشیاء کی قیمتوں پر نہیں ڈال سکتی بلکہ یہ اثر اس اعتبار کا نتیجہ ہے، جس کا کہ ہنڈی مذکور محض ایک تحریری ثبوت یا شہادت ہے۔ سوداگروں کی بہیوں [31] میں جو خریداروں کا حساب درج ہوتا ہے، وہ بھی اشیاء کی قیمتوں میں ویسا ہی اثر ڈال سکتا ہے کیونکہ یہ بھی اعتبار ہی کی ایک شکل ہے۔ ہاں اس قدر فرق ضرور ہے کہ ہنڈی کی طرح بہی کا حساب دست بدست منتقل نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے اس میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ اس کی وساطت سے تجارتی اشیاء خریدی جا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشیاء کی قیمتوں پر حساب مذکور کا اثر محدود ہوتا ہے۔

اعتبار کا ایک اور اثر یہ ہے کہ اس کا استعمال کسی خاص فرد یا ملک کی قوت خرید کو بہت زیادہ کر

دیتا ہے۔ اگر خرید و فروخت میں اعتبار سے کام نہ لیا جاتا تو اشیاء کی طلب موجودہ صورت سے بہت کم ہوتی۔ یہ سب اسی کا ظہور ہے کہ بعض دفعہ کسی شے کی مانگ غیر محدود طور پر بڑھ جاتی ہے۔ ۱۸۲۹ء میں جب ہماری سرکار کا ملک چین سے تنازع ہوا تو اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ چائے کی رسد کم ہو جائے گی اور اس واسطے اس کی قیمت بہت بڑھ جائے گی۔ لہٰذا اکثر دکاندار اس امر کے خواہش مند تھے کہ شے مذکورہ کا ذخیرہ جمع کر لیں اور ضرورت کے موقع پر فائدہ اٹھائیں۔ ایک دکاندار کے پاس صرف ۱۲۰۰ پونڈ کا سرمایہ تھا جو اس کے تجارتی کاروبار میں لگا ہوا تھا لیکن اس نے یہ تدبیر کی کہ جن سوداگروں کے ساتھ اس کی مدت سے ساکھ چلی آتی تھی ان سے اپنے نام کی سہ ماہی ہنڈیاں دے کر چائے کی ایک کثیر مقدار خرید کر لی۔ ہنڈیوں کی میعاد ختم ہونے سے پیشتر ہی چائے کی قیمت بہت بڑھ گئی اور دکاندار مذکور نے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ اگر اعتبار نہ ہوتا تو دکاندار مذکور میں یہ قوت خرید نہ ہوتی جو اس کے لیے اس قدر سود مند ثابت ہوئی۔

حوالہ جات:۔

(1) ''اعتبار'' جیسا کہ ہم پہلے بھی اشارہ کر چکے ہیں Credit کا ترجمہ ہے اور آج بھی معاشیات میں یہی اصطلاح مستعمل ہے۔

(2) اصل مسودہ میں ''ہو سکتی'' تھا۔

(3) مراد وہ رجسٹر ہے جس میں حسابات (Accounts) لکھے جاتے ہیں۔

حصہ چہارم

پیداوار دولت کے حصہ دار

- ☆ لگان
- ☆ سود
- ☆ منافع
- ☆ اجرت
- ☆ مقابلہ ناکمل
- ☆ مال گزاری

باب اول

پیداوار دولت کے حصہ دار-لگان

تمدن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں حق ملکیت یا جائیداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا۔ محنت کی پیداوار میں حسب ضرورت ہر شخص کا حصہ تھا۔ ہر شے ہر شخص کی گویا ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے اور یہ کسی اور کی۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی نہ چوری کا کھٹکا تھا۔ قبائل انسانی مل کر گزران کرتے تھے اور امن و صلح کاری کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے۔ یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن میں انسان کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی کسی نہ کسی صورت میں مروج ہے۔ زمانہ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدن کی یہی صورت سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ نظام قدرت میں نوع انسانی کے تمام افراد مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ کوئی کسی کا دبیل نہیں ہے اور تمام تمدنی امتیازات مثلاً سرمایہ دار اور محنتی، آقا و ملازم وغیرہ بالکل بے معنی ہیں۔ جائیداد شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ لہٰذا اقوام دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان بے جا امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے قدیمی اور قدرتی اصول مشارکت فی الاشیاء کو مروج کیا جائے اور کچھ نہیں تو کم از کم ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عملدرآمد کیا جائے کیونکہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے۔ جس پر قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے۔ حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے، لیکن ہم اس کا مفصل ذکر اس ابتدائی کتاب میں نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہیے کہ نظام تمدن کی موجودہ صورت میں جائیداد شخصی ایک ضروری جزو ہے اور پیداوار محنت یعنی دولت کی تقسیم اسی کی رو سے ہوتی ہے۔ کتاب کے اس حصے میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں جن کے عمل سے دولت اپنے پیدا کرنے والوں کے درمیان تقسیم ہوتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ تمام ممالک میں جہاں دستکاری ایک مرتب و منتظم صورت میں ہے دولت چار حصوں میں تقسیم ہوتی ہے[1] یعنی

(1) زمیندار کا حصہ یا لگان۔

(2) سرمایہ دار کا حصہ یا سود۔

(3) مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع۔

(4) محنتی کا حصہ یا اجرت۔

مفتوح ممالک میں دولت کا ایک پانچواں حصہ دار بھی ہوتا ہے یعنی حکمران جس کے حصے کو مال گزاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ باب ہذا میں ہم صرف لگان[2] کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

لگان وہ معاوضہ نقد یا جنس ہے جو زمین کے استعمال کے عوض میں مالک زمین کو ادا کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ معاوضہ بالعموم نقدی یا جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے تاہم خدمت کی صورت میں بھی ادا ہو سکتا ہے۔ جیسے ہندوستان کے[3] بعض دیہات[4] میں مالکانِ دِہ امام مسجد کو ایک خاص قطعہ زمین کاشت کے لیے دے دیتے ہیں اور اس سے کوئی لگان نہیں وصول کرتے۔ گویا اس کی مذہبی خدمت ہی لگان تصور کی جاتی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زمین جس کے استعمال کے عوض میں لگان ادا کیا جاتا ہے مزروعہ ہی ہو بلکہ لگان ایک وسیع لفظ ہے جس کا اطلاق کانوں، چراگاہوں اور حقوق آب پاشی وغیرہ کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔

اس مقام پر تم قدرتاً یہ سوال کرو گے کہ لگان کی مقدار کس طرح متعین ہوتی ہے یا وہ کون سے اسباب ہیں جو اس مقدار کی تعیین میں اثر رکھتے ہیں؟ تم اس کتاب کے کسی گزشتہ باب میں پڑھ آئے ہو کہ قانون طلب و رسد ایک ایسا اقتصادی قانون ہے جس کے عمل سے ہر شے کی قیمت متعین ہوتی ہے۔ لگان کی مقدار بھی اس وسیع قانون کے عمل سے آزاد نہیں ہے۔ البتہ بعض ممالک میں اختلاف حالات کے سبب سے اس قانون کا عمل کامل طور پر نہیں ہو سکتا۔ ریاست ہائے[5] متحدہ امریکہ میں اور علیٰ ہذا القیاس کینیڈا اور آسٹریلیا میں چونکہ زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان ایک بلا قید اور آزاد مقابلہ ہے، اس واسطے وہاں کے لگان اسی قانون کے عمل سے متعین ہوتے ہیں۔ انگلستان میں چونکہ کاشتکاروں کے ساتھ بسا اوقات ہمدردی کی جاتی ہے اس واسطے قانون مذکور پورے طور پر اپنا عمل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زمیندار کاشتکاروں کو کئی طرح کی رعایات دے دینے کے باعث اقتصادی معنوں میں

پوری مقدار لگان کی حاصل نہیں کر سکتے۔ آئرلینڈ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے قومی اور مذہبی اختلافات اور کاشتکاروں کی آبادی کے بڑھ جانے کے باعث مقابلہ کی کوئی انتہا نہیں رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بے چارے کاشتکار اندازے سے زیادہ لگان ادا کرنے پر مجبور ہو جانے کے سبب سے ہمیشہ زمینداروں کے مقروض رہتے ہیں اور روز بروز مفلس ہوتے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں مزارعین کی کئی اقسام ہیں، یعنی تابع مرضی میعادی یا غیر میعادی اور مزارعین موروثی جن کو اس زمین پر جس کو وہ کاشت کرتے ہیں ایک خاص قسم کا حق ملکیت حاصل ہوتا ہے۔ مقدم الذکر مزارعین کی صورت میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لگان کی تعیین قانون طلب و رسد کے عمل پر انحصار رکھتی ہے مگر موخر الذکر قسم کے مزارعین کے لگان کی مقدار قانوناً مقرر ہے اور بعض خاص صورتوں کے سوائے اس مقرر مقدار میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ نظری لحاظ سے ہندوستان میں سرکار خود زمیندار ہے اور ہمیشہ اس امر میں ساعی رہتی ہے کہ مزارعین کی حقیت اراضی ہر طرح سے محفوظ ہو۔

یاد رکھنا چاہیے کہ زمین کی قیمت اور اس کے لگان کے درمیان ایک ضروری تعلق ہے۔ زمین کی قیمت صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس سے لگان ملتا ہے۔ اگر لگان نہ ہوتا تو قیمت بھی نہ ہوتی، لیکن اگرچہ یہ تعلق بڑا ضروری ہے بلکہ ایک طرح سے وہی تعلق ہے جو علت و معلول کے درمیان ہوتا ہے تاہم قیمت زمین اور لگان کی درمیانی نسبت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض ممالک میں جہاں سرمائے کی مقدار بہت ہے اور انسانی حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں اور زمین کی ملکیت سے ایک تمدنی امتیاز حاصل ہوتا ہے، وہاں زمین کی قیمت اس کے سالانہ لگان سے بیس پچیس بلکہ تیس گنا بھی ہوتی ہے کیونکہ ان ممالک میں خریدار زمین کو صرف لگان ہی کا خیال نہیں ہوتا، بلکہ وہ اعزاز و امتیاز بھی اس کے مدنظر ہوتا ہے جو خرید زمین کا ضروری نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

لگان کے متعلق ایک اور ضروری مسئلہ یاد رکھنا بھی لازم ہے، اور وہ یہ ہے کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر لگان معاف کر دیے جائیں تو زرعی پیداوار کی قیمت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اس کتاب کے کسی گزشتہ باب میں ہم دو اقتصادی اصول بیان کر آئے ہیں:-

(1) ایک ہی منڈی میں ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوا کرتی ہے۔

(2) کسی شے کی معمولی قیمت اس شے کی رسد کے اس حصے کے مصارف پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو۔

ان ہر دو اصول کو ملحوظ خاطر رکھ کر مندرجہ بالا مسئلے کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ انگلستان کو جس قدر غلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سارے کا سارا انگلستان کی زمینوں میں ہی پیدا نہیں کیا جاتا بلکہ بعید المقام ممالک سے لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انگلستان کو اخراجات انتقال بار برداری کے علاوہ اس غلے کے مصارف پیدائش بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ پس ہر دو مندرجہ بالا اصول کی رو سے ضرور ہے کہ انگلستانی غلے کی قیمت اس غلے کی قیمت کے برابر ہو جو دیگر مقامات سے لایا جاتا ہے کیونکہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی شے کی دو مختلف قیمتیں نہیں ہو سکتیں بشرطیکہ ان کے خواص میں کوئی نمایاں فرق نہ ہو۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جو شخص انگلستان میں ان غیر ممالک کی نسبت جو انگلستان کو غلہ مہیا کرتے ہیں کم مصارف پر غلہ پیدا کر سکتا ہے، وہ فائدے میں رہتا ہے۔ کیونکہ انگلستانی غلے کی قیمت اس غلے کی قیمت کے مساوی ہو گی جو دیگر ممالک سے لایا جاتا ہے۔ یہ فائدہ یا تو مالک زمین کا حق ہے، یا کاشتکار کا۔ محنتی اور خریدار غلہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ فرضاً اگر کوئی مالک زمین نصف لگان معاف کر دے تو اس کا مزارع یا کاشتکار غلے کو کم قیمت پر فروخت نہیں کریں گے کیونکہ وہ غلہ مذکور کو قیمت متعارف پر فروخت کر سکتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ مزارع مذکور اپنے کھیتوں کے مزدوروں کو زیادہ اجرت ادا کریں کیونکہ اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ مزدور مذکور اپنی پہلی اجرت کے عوض کام کرنے پر رضامند نہ ہوں گے۔ پس لگان پیداوار کا وہ حصہ ہے جو زرخیزی کے لحاظ سے ادنیٰ ترین زمین کے اخراجات زراعت نکال کر باقی رہتا ہے' اس کا تعلق صرف زمیندار اور کاشتکار سے ہے اور کسی کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ زمیندار اپنا لگان مزارع کو دے دے مگر اس صورت میں یہ کاشتکار یعنی مزارع اسے اپنے قبضے میں رکھے گا اور اسے قیمت متعارف پر فروخت کرنے سے خود فائدہ اٹھائے گا۔ جب وہ اسے قیمت متعارف پر فروخت کر کے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کھیت کے مزدوروں کو زیادہ اجرت دے کر یا لگان مذکور کو کم قیمت پر فروخت کر کے عام دستکاروں یا غلے کے خریداروں کو فائدہ پہنچائے۔

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ جائیداد شخصی کی صورت میں لگان خود بخود پیدا ہوتا ہے اور نیز ایک خاص اصول ہے جس کی رو سے اس کی مقدار متعین ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ لگان

جائیداد شخصی کی صورت میں مالک زمین کا حق ہے اور مزارع کو صرف اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ مالک زمین اپنی مرضی سے اس کو عطا کر دے۔ علیٰ ہذا القیاس قوانین اقتصاد کی رو سے مزارع، مزدور اور خریدار غلہ کو بھی اس سے کوئی سروکار نہیں ہے جب تک مزارع اپنی مرضی سے ان کو عطا نہ کرے۔ مزید برآں یہ امر بھی ظاہر ہے کہ جوں جوں آبادی بڑھتی ہے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں ان کا لگان بڑھ جاتا ہے۔ زمیندار روز بروز دولت مند ہوتے جاتے ہیں حالانکہ یہ مزید دولت جو ان کو ملتی ہے نہ ان کی ذاتی کوششوں اور نہ ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجہ ہوتی ہے بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی کوششیں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا پھر ان کا کوئی حق نہیں کہ وہ دولت مند ہوتے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی، لیکن جب ان کی دولت مندی کے یہ اسباب نہیں ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی امیری صریحاً اصول انصاف کے خلاف ہے۔ ان نتائج کو ملحوظ رکھ کر بعض محققین نے بڑے زور شور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ناانصافی جائیداد شخصی سے پیدا ہوتی ہے، جس کا وجود قومی بہبودی کے لیے انتہا درجے کا مضرت رساں ہے۔ پس حکماء کے اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہیے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ لگان کی یہ زائد مقدار جو آبادی کی زیادتی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے سرکار یا قوم کا حق ہے، نہ کہ زمینداروں کا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ بحث ہے، لیکن چونکہ یہ ابتدائی کتاب اس کے لیے موزوں نہیں اس واسطے ہم اسے نظرانداز کرتے ہیں۔

حوالہ جات:۔

(1) یہاں "ہے" رہ گیا تھا جس کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(2) Rent (مرتب)۔

(3) یہاں "کے" رہ گیا ہے، جس کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (مرتب)

(4) "دیہات" کو سب جگہ "دھات" لکھا گیا تھا جو غالباً کتابت کی غلطی تھی۔ اسے درست کر کے "دیہات" کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(5) یہاں اصل نسخے میں "صوبجات" تھا۔ (مرتب)

باب دوم

ساہوکار کا حصہ یا سود

حصہ دوم میں معلوم ہو چکا ہے کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور زمین کے فطری قوئ، ہوا، پانی وغیرہ اس میں داخل نہیں۔ ظاہر ہے کہ دولت کی پیداوار کا کچھ حصہ یا بہت زیادہ حصہ دستکاروں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کی ضروریات پر صرف ہوتا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ پیداوار دولت کی تمام و کمال مقدار اسی طرح صرف نہ ہو جائے، جب تک کہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جو دولت کو جذبات نفسانی کے نتیجہ سے چھوڑا کر کسی قوم کے افراد کو جمع کرنے کی ترغیب و تحریص دے۔ مہذب ممالک میں تجارت کی وسعت کے ساتھ جمع کرنے کی خواہش کو بہت تحریک ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس سرمایہ ہو۔ جس کو خود کسی کام پر لگا کر نفع اٹھاؤں یا کسی اور کو مستعار دے کر اس کے معاوضے میں سود لوں۔ یہ نفع یا سود جو استعمال سرمایہ کے عوض میں ادا کیا جاتا ہے جمع کرنے کا ایک زبردست محرک ہے۔ تاہم اقوام دنیا کے مختلف افراد پر اس کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سود زر نقد یا روپے کے استعمال کے عوض میں ادا کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اصل مطلب زر نقد نہیں ہے بلکہ وہ اشیاء ہیں جو زر نقد مستعار کی وساطت سے حاصل کی جاتی ہیں اور جن کو بطور سرمایہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مزید برآں زمانہ حال میں تجارت کے اکثر کاروبار ساکھ یا اعتبار کے بل پر چلتے ہیں۔ اس واسطے خرید و فروخت میں زر نقد کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ پس سود استعمال زر نقد کے عوض میں نہیں بلکہ استعمال سرمایہ کے معاوضے میں ادا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی مستقل شرح اس نسبت پر منحصر ہے جو کسی ملک میں قرضوں کی مانگ اور سرمائے کی اس مقدار کے درمیان ہو جو سود پر دی جا سکتی ہو۔ شرح سود کی زیادتی کمی سرمایہ پر دلالت کرتی ہے اور اس کی کمی زیادتی سرمایہ پر۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شرح سود کی زیادتی اقتصادی لحاظ سے غیر مفید نہیں کیونکہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور شرح سود اس بچت کا

انعام ہے۔ لہٰذا جس قدر شرح سود زیادہ ہوگی اسی قدر لوگوں کو جمع کرنے کی تحریک ہوگی اور سرمائے کی مقدار بڑھتی جائے گی۔

پس صاف ظاہر ہے کہ کسی ملک میں ایسے قوانین کا وضع ہونا جن کا منشا شرح سود کو کم کرنا یا اس کی زیادتی کو روکنا ہو، گویا ان اسباب کے عمل کو روکنا ہے، جن کی وساطت سے سرمائے کی رسد بڑھتی ہے مگر برعکس اس کے یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی ملک میں شرح سود کی کمی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہاں کی تمدنی حالت ہر طرح سے محمود ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ شرح سود کی کمی سرمائے کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی تو نکل سکتا ہے کہ سرمائے کی مقدار اس سرعت اور تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے کہ اب اس کے بار آور استعمال کی کوئی مزید صورت رہی ہی نہیں اور نظام تمدن کا شیرازہ ایسا بگڑ گیا ہے اور لوگ اس قدر کاہل و آرام طلب ہو گئے ہیں کہ نئے نئے تجارتی اور صنعتی مشاغل کا بار اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے۔

شرح سود کی زیادتی کے کئی اسباب ہیں۔ لوگ ممالک غیر میں اپنا سرمایہ سود پر نہیں دیتے جب تک کہ زیادہ شرح سود نہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک میں شرح سود کی مقدار مساوی نہیں ہوتی۔ مزید برآں شرح سود کی مقدار اس منافع پر بھی انحصار رکھتی ہے جو سرمائے کے استعمال سے حاصل ہو۔ ملک آسٹریلیا کے کسانوں کو زراعت سے بیس فیصدی منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ لوگ سرمایہ مستعار کے عوض میں شرح سود کی ایک بہت زیادہ مقدار دے سکتے ہیں، بہ نسبت ان ممالک کے جہاں زراعت سے اس قدر منافع حاصل نہیں ہوتا۔ علیٰ ہذا القیاس اشیائے خوردنی کی ارزانی مصارف محنت کو کم کر کے منافع کی مقدار کو زیادہ کرتی ہے، جس سے شرح سود کی مقدار بھی بڑھتی ہے۔ برخلاف اس کے سونے چاندی کی نئی نئی کانوں کا دریافت ہو جانا سرمائے کی رسد کو زیادہ کرتا ہے۔ اس واسطے شرح سود کی مقدار کم ہو جاتی ہے اور نیز کسی ملک کے مختلف بنکوں کا باہمی مقابلہ بھی جو ہمیشہ اپنے اپنے سرمائے کو لگانے کی فکر میں رہتے ہیں، شرح سود کی مقدار کو کم کرتا ہے۔ زمانہ حال میں مندرجہ ذیل اسباب کے اثر سے شرح سود زیادہ ہوتی گئی ہے۔

(۱) وسائل آمد و رفت کی سہولت سے لوگوں کو غیر ممالک میں سرمایہ منتقل کرنا آسان ہو گیا ہے۔ جس ملک سے سرمایہ منتقل ہو وہاں اس کی رسد کم ہوتی جائے گی لہٰذا اس ملک میں شرح سود بڑھے گی۔

(۲) مختلف ممالک کے ارکان سلطنت اخراجات جنگ اور دیگر رفاہ عام کے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کے لیے رعایا سے قرض اٹھاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سرمائے کی مقدار ملک میں عام طور پر مستعار دی جا سکتی جس سے شرح سود کی مقدار بہ سبب زیادتی رسد سرمایہ کم ہو جاتی۔

(۳) دیگر ممالک سے اشیائے خوردنی وغیرہ کا خرید کرنا کسی ملک کے سرمائے کی مقدار کو کم کرتا ہے جس سے اس ملک میں شرح سود کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔

(۴) چونکہ مشترک سرمائے والی کمپنیاں [1] قانوناً جائز تصور کی گئی ہیں، اس واسطے ساہوکاروں میں سے اکثر لوگوں نے متفق ہو کر تجارتی کمپنیاں قائم کر لی ہیں۔ لہٰذا سرمائے کی وہ مقدار جو پہلے سود پر اوروں کو دی جا سکتی تھی تجارت کی مختلف شاخوں میں لگ گئی ہے۔ جس سے اس سرمائے کی مقدار کم ہو گئی ہے جو مستعار دیا جا سکے۔ لہٰذا شرح سود بڑھ گئی ہے۔

تم شاید یہ سمجھو گے کہ شرح سود اور لگان دونوں ایک ہی جنس کی نوعیں ہیں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ جوں جوں آبادی زیادہ ہوتی ہے تہذیب و تمدن ترقی کرتے ہیں اور دولت کی پیداوار بڑھتی ہے توں توں جیسا کہ ہم باب گزشتہ میں کہہ آئے ہیں، لگان کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن شرح سود ان حالات میں بوجہ افزائش سرمایہ کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس لگان اور سود میں ایک یہ بھی ضروری فرق ہے کہ مقدم الذکر، جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں اشیاء کی قیمتوں کا کوئی جزو نہیں ہے، لیکن موخر الذکر ان کی قیمتوں کا جزو ہے۔ کیونکہ شرح سود کی کمی بیشی اس منافع کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے جو تجارت کی کسی شاخ پر سرمایہ لگانے سے حاصل ہوتی ہے اور منافع کی کمی بیشی اشیاء کی قیمتوں کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔

اکثر صورتوں میں ساہوکاروں کو اپنے قرضداروں پر پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ بعض صورتوں میں ان کو سرمائے کی عدم ادائیگی یا کسی اور قسم کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ اپنے قرضداروں کو شرح سود کی ایک غیر معمولی مقدار پر سرمایہ قرض دیتے ہیں۔ اس غیر معمولی شرح سود کو جو احتمال عدم ادائیگی یا نقصان کے اندیشے کی وجہ سے حاصل کی جاتی ہے اصطلاح اقتصاد میں سود کاذب [2] کہتے ہیں۔ کیونکہ شرح سود کی اصلی اور صحیح مقدار وہی ہے جس کی تعیین میں کسی قسم کے اندیشہ و نقصان کو دخل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک تجارتی مرکز میں شرح سود کی مقدار کہیں کچھ اور کہیں کچھ ہوتی ہے۔ قیمت اشیاء کے متعلق تم ایک اقتصادی اصول پڑھ چکے ہو کہ ایک ہی منڈی میں

ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یادرکھنا چاہیے کہ یہ اصول شرح سود یا بالفاظ دیگر اس قیمت کے متعلق صحیح نہیں ہے جو استعمال سرمائے کے عوض میں دی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شرح سود کی تعیین میں بسا اوقات احتمال نقصان کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ جہاں روپے کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہو وہاں ساہوکار زیادہ شرح سود لے لیتے ہیں اور جہاں نقصان کا احتمال کم ہو یا بالکل نہ ہو یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جہاں ان کو روپے کے واپس مل جانے اور سود کے باقاعدہ ادا ہوتے رہنے کا پورا یقین ہو، وہاں کم شرح سود پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ لوگ بالعموم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ دنیا میں ان کا بھرم نہ نکل جائے، اس واسطے حتیٰ المقدور مستعار سرمایہ لینے کو اوروں سے چھپاتے ہیں اور اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ مختلف ساہوکاروں کے درمیان ایک قسم کی تجارتی ضد یا مقابلہ پیدا کر دیں جس سے شرح سود کی مقدار کم ہو جائے اور ان کو فائدہ پہنچے۔ لہٰذا مستعار سرمایہ لینے والوں کو حالات کا پورا علم نہیں ہوتا اور ساہوکاروں کے درمیان باہمی مقابلہ کامل طور پر اپنا اثر نہیں دکھا سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ساہوکار شرح سود کی مختلف مقداروں پر روپیہ قرض دیتے ہیں۔

علیٰ ہٰذا القیاس دنیا کی مختلف تجارت گاہوں میں بھی شرح سود کے اختلاف کے اسباب یہی ہیں جو بیان ہوئے۔ مگر اس خاص صورت میں اختلاف کا ایک اور باعث بھی ہے، یعنی ساہوکار عموماً اپنا سرمایہ غیر ممالک کے لوگوں کو مستعار نہیں دیتے جس سے شرح سود میں مقامی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کو اور باتوں کے علاوہ یہ خیال بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر کسی سبب سے سرمایہ مستعار کی وصولی وغیرہ کے لیے عدالت تک نوبت پہنچی تو اجنبیوں کے ساتھ جھگڑا رگڑا کرنے میں خواہ مخواہ کی دقت ہوگی۔ بسا اوقات اقوام کا باہمی تعصب اور بدظنی اور قابل اعتماد دلالوں کا دستیاب نہ ہو سکنا بھی ساہوکار کو غیر ممالک میں روپیہ لگانے سے روکتا ہے۔ مزید برآں ان کو فطرتاً یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں شرح سود کی تھوڑی سی مقدار پر اکتفا کرنا اچھا ہے۔ بجائے اس کے کہ سرمایہ دیگر ممالک میں منتقل کریں، جہاں کے حالات کا کافی علم نہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا احتمال ہے۔

حوالہ جات:-

(1) Joint Stock Companies (مرتب)

(2) مصنف نے "سود کا لب" کے الفاظ "سود خام" (Gross Interest) کے لیے استعمال کیے ہیں۔ (مرتب)

باب سوم

مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع

پیداوار دولت کا تیسرا حصہ دار مالک یا کارخانہ دار ہے جو صنعت کی مختلف شاخوں کو مرتب و منظم کرتا ہے اور جس کا فرض علاوہ دیگر فرائض کے ایک اس امر کا فیصلہ کرنا بھی ہوتا ہے کہ کون کون سی اشیاء کس کس مقدار میں تیار کی جائیں گی اور کس قیمت پر فروخت کی جائیں گی۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ تمدن انسانی کے ابتدائی مراحل میں مالک یا کارخانہ دار کا وجود ضروری نہیں ہوتا، لیکن پیدائش دولت کی مختلف صورتوں کا پیچیدہ ہوتے جانا، کلوں کی ایجاد اور تجارت کی وسعت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی فرد ایسا بھی ہو جو دست کاری کے کاروان کے لیے قافلہ سالار کا کام دے اور جس کا ذاتی تجربہ، انتظامی قوت اور تجارت کے نشیب و فراز سے واقف ہونا صنعت کی روز افزوں پیچیدگیوں کو سلجھاتا رہے۔ تم جانتے ہو تمدن کی اعلیٰ صورتوں میں جب کہ صنعت انتہا درجے کی ترقی کر جاتی ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص جس کے پاس سرمایہ موجود ہو مالک یا کارخانہ دار کا کام بھی دے سکے۔ کیونکہ کارخانہ داری کے لیے دیگر اوصاف کے علاوہ ایک خاص قسم کی انتظامی قوت، عاقبت بینی اور ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکنے کی قابلیت لازم ہے جس سے بالعموم ہر سرمایہ دار متصف نہیں ہوتا۔ لہذا جس طرح سرمایہ مہیا کرنے کے عوض میں ساہوکار یا سرمایہ دار کو ایک خاص معاوضہ ملتا ہے جو شرح سود کہلاتا ہے، اسی طرح پیدائش دولت کے سلسلے میں کارخانہ دار کو بعض فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک خاص معاوضہ ملتا ہے جس کو منافع کہتے ہیں۔ اکثر محققین اقتصاد نے کارخانہ دار اور سرمایہ دار یا ساہوکار یا یوں کہو کہ منافع اور سود میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ اس واسطے وہ منافع کو استعمال سرمایہ کا معاوضہ سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ کارخانہ دار کو ملتا ہے اسے محض اجرت انتظام و نگرانی وغیرہ تصور کرتے ہیں، لیکن صاف ظاہر ہے کہ پیدائش کے سلسلے میں سرمایہ دار اور کارخانہ دار مختلف اقسام کے فرائض ادا کرتے ہیں

اور موخر الذکر کا حصہ ایسا بے حقیقت نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اقتصادی لحاظ سے اسے اجرت کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے۔ جیسا کہ ابھی واضح ہوگا کہ ہر کارخانہ دار جس میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ہیں سرمایہ دار بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اوروں سے کسی خاص شرح سود پر سرمایہ حاصل کر سکتا ہے خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ تجارتی کاروبار کا زیادہ تر حصہ اعتبار پر چلتا ہے مگر ہر سرمایہ دار یا ساہوکار کارخانہ دار نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اوصاف جو کارخانہ داری کے لیے ضروری ہوتے ہیں ہر سرمایہ دار میں موجود نہیں ہوتے۔ ہاں اگر کسی سرمایہ دار یا ساہوکار میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ہوں تو وہ دونوں کے فرائض کو انجام دے کر دگنا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

تم جانتے ہو کسی شے کے مصارف پیدائش سے مراد ان اخراجات کی ہے جو اس شے کی تیاری اور اس کو خرید و فروخت کے مقام وغیرہ پر لانے میں صرف ہوتے ہیں کارخانہ دار کی خواہش اور امید یہ ہوتی ہے کہ اس شے کی قیمت فروخت یا قدر اس کے مصارف پیدائش سے بڑھ جائے۔ لہٰذا منافع اس فرض کے برابر ہوتا ہے جو کسی شے کی قیمت فروخت اور اس کے مصارف پیدائش کے درمیان ہو۔ بشرطیکہ مقدم الذکر موخر الذکر سے مقدار میں زیادہ ہو کیونکہ اگر قیمت فروخت مصارف پیدائش سے کم ہوگی تو اس سے کارخانہ دار کو منافع نہیں ہوگا بلکہ گھاٹا ہوگا۔ تجارت اشیاء میں یہ نفع جو کارخانہ دار کو ہوتا ہے منافع کہلاتا ہے اور قرضوں کی تجارت کی صورت میں اس نفع کو منافع کے نام سے نہیں بلکہ سود یا مٹی کاٹنے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وسیع معنوں میں منافع کا مفہوم یہی ہے جو بیان ہوا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ منافع کی حقیقت پر بحث کرنے والوں میں سے بعض نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ جس طرح شرح سود سے مراد ایک خاص مقدار کی ہے جو سرمائے کو ایک خاص مدت تک استعمال کرنے کے عوض میں ادا کی جاتی ہے' اسی طرح شرح منافع سے مراد منافع کی ایک خاص مقدار ہے جو ایک خاص مدت میں حاصل ہو۔ مگر بعض محققین غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شرح منافع کی تعیین میں مدت کو کوئی دخل نہیں ہے اور شرح منافع صرف مقادیر منافع اور سرمائے کی درمیانی نسبت پر منحصر ہے مگر یہ رائے صریحا غلط ہے۔ فرضاً اگر میں تجارت کی کسی شاخ پر سو روپیہ سرمایہ لگاؤں اور مجھے پانچ روپیہ یومیہ منافع ہو تو صاف ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ ۱۵۰ روپیہ فی صدی ہے۔ لیکن اگر اس قدر منافع دو ماہ کی میعاد میں حاصل ہو تو شرح منافع ۷۵ روپیہ فی صدی فی ماہ ہوگی نہ کہ ۱۵۰ فی صدی۔ لہٰذا شرح منافع کی مقدار نہ صرف سرمائے کی مقدار پر منحصر ہے بلکہ اس مدت پر بھی انحصار رکھتی ہے جس میں منافع کی کل مقدار

حاصل ہو۔ جس قدر کسی شے کی قیمت فروخت اس کے مصارف پیدائش سے زیادہ ہوگی اسی قدر شرح منافع مقدار بھی زیادہ ہوگی اور جس قدر قیمت فروخت کم ہوگی اسی قدر شرح منافع کی مقدار بھی کم ہو گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اس مدت کی مقدار جس میں کل منافع حاصل ہوا ہے کم ہوگی تو شرح منافع کی مقدار زیادہ ہوگی اور اگر مقدم الذکر کی مقدار زیادہ ہوگی تو موخر الذکر کی مقدار کم ہوگی۔ مثلاً اگر سرمائے کی کسی خاص مقدار کے عوض دو ماہ میں پچاس روپیہ منافع ہو تو شرح منافع فی ماہ پچیس روپیہ ہوگی لیکن اگر یہ پچاس روپیہ منافع پانچ ماہ میں حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ دس روپیہ ہوگی۔ لہٰذا شرح منافع کے متعلق یہ ضروری اصول قائم ہوا کہ ''شرح منافع مصارف پیدائش اور اس مدت کے ساتھ جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو نسبت معکوس رکھتی ہے'' اس ذرا سی بات کو نہ سمجھنے کے باعث بعض محققین نے بڑی بڑی غلطیاں کھائی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ منافع کی مقدار صرف اسی صورت میں زیادہ ہو سکتی ہے جب کہ اجرت کی مقدار کم ہو اور اسی صورت میں کم ہو سکتی ہے جب کہ اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک کارخانہ داروں اور محنتیوں کے سود و زیاں کے درمیان ایک قسم کا ضروری تناقض ہے۔ یا یوں کہو کہ ایک کا نفع اور دوسرے کا نقصان ہے، لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے شرح منافع کی تعیین میں مدت کو بھی بڑا دخل ہے یعنی اگر سرمائے اور منافع کے مقادیر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو تو جس مدت میں منافع کی ایک خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اس مدت کے کم ہو جانے یا یوں کہو کہ اشیاء تجارتی کے بہت جلد فروخت ہو جانے سے شرح منافع بڑھ جاتی ہے اور اس مدت کی زیادتی سے شرح منافع کم ہو جاتی ہے' خواہ اجرت کی مقدار میں فرق پیدا ہو یا نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ اجرت کی مقدار بڑھ جائے اور منافع کی مقدار کم ہو جائے مگر باوجود اس کے شرح منافع زیادہ ہو جائے مثلاً فرض کرو کہ سرمایہ ایک سو پونڈ کے برابر ہے اور منافع سالانہ بیس پونڈ ہے۔ اگر بیس پونڈ منافع ایک ماہ میں حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ شرح منافع کی مقدار ۲۴۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہوگی۔ فرض کرو کہ شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے سرمایہ دار پانچ پونڈ بطور اجرت ادا کرتا ہے اس صورت میں مصارف پیدائش ۱۰۵ پونڈ ہوئے اور منافع ماہانہ ۱۴۰۳ یا قریباً ۱۵ پونڈ فی صدی ہوا۔ لہٰذا شرح منافع ۱۶۷ پونڈ سالانہ فی صدی سے بھی زیادہ ہوئی، لیکن فرض کرو کہ مدت منافع اس سے بھی بڑھ گئی ہے اور منافع کی مقدار بجائے بیس پونڈ فی ماہ کے بیس پونڈ فی یوم ہو گئی یا یوں کہو کہ شرح منافع ۷۳۰۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہے۔ اگر شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے ۱۰ پونڈ بطور اجرت ادا کیے

یہ تو ظاہر ہے کہ ۱۱۰ پونڈ لگانے پر ۱۰ پونڈ یا سیہ منافع ہوگا جس کے یہ معنی ہیں کہ شرح منافع تقریباً ۹ فی صدی سے زیادہ، یا ۳۳۱/۸ سالانہ فی صدی سے زیادہ ہے۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ جس مدت میں کسی شے کے مجموعی منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اجرت اور شرح منافع ایک ساتھ بڑھ سکتے ہیں گو منافع کی مجموعی مقدار کم ہی کیوں نہ ہو جائے۔ لہٰذا دستکاروں و خریداروں اور کفایت داروں کے نفع و نقصان کے درمیان کوئی تناقض نہیں ہے اور شرح منافع مختلف مندرجہ ذیل اسباب پر منحصر ہے۔

(الف) وہ تمام اسباب جو اشیائے تجارتی کے مصارف پیدائش کو کم کرتے ہیں منافع کی کل مقدار کو زیادہ کرتے ہیں جس کے یہ معنی ہیں کہ شرح منافع بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے مگر مصارف پیدائش صرف اسی صورت میں کم ہو سکتے ہیں کہ:

(۱) دستکار کی کارکردگی بڑھ جائے اور اس کی اجرت بدستور وہی رہے۔

(۲) اجرت کم ہو جائے اگرچہ محنت کی کارکردگی اور اشیائے خوردنی وغیرہ کی قیمت خرید بدستور رہی رہے۔

(۳) اشیائے خوردنی وغیرہ ارزاں ہو جائیں مگر دستکار کو ان کی اسی قدر مقدار مل سکے جو پیشتر ملا کرتی تھی۔ برخلاف اس کے اگر کمی تعلیم یا سرمایہ قائم مثلاً کلوں وغیرہ کے تلف ہو جانے یا دستکار کی جسمانی قوت میں زوال آجانے کے باعث محنت کی کارکردگی کم ہو جائے یا دستکار کی اجرت بڑھ جائے مگر اشیائے خوردنی ارزاں نہ ہوں یا اجرت بدستور ہی رہے اور اشیائے خوردنی وغیرہ گراں ہو جائیں تو منافع کی مقدار کم ہوگی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ شرح منافع کی مقدار بھی اسی نسبت سے کم ہوگی۔ بشرطیکہ اس مدت میں کوئی تغیر نہ ہو جس میں کل منافع کی مقدار حاصل ہوتی ہے۔

(ب) شرح منافع کی تعیین میں چونکہ مدت کو بھی دخل ہے لہٰذا اگر وہ مدت جس میں منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے، کم ہو جائے تو شرح منافع زیادہ ہوگی۔

منافع کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مصالح جس سے تجارتی اشیاء تیار ہوتی ہیں، مانگ کے بڑھ جانے کی وجہ سے گراں ہو جاتا ہے اور لوگ تجارت کی دیگر شاخوں سے اپنا سرمایہ نکال کر اس شاخ میں لگانا شروع کر دیتے ہیں جہاں شرح منافع نسبتاً زیادہ ہے مگر یہ حالت دیر تک نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ سرمائے کی زیادتی سے اشیاء کی رسد ان کی مانگ سے بڑھ جاتی ہے۔ لہٰذا قیمتیں کم ہو جاتی ہیں

اور شرح منافع اپنی پہلی حالت پر عود کر آتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات معمول سے کم بھی ہو جاتی ہے۔

ماہیت منافع کی مزید توضیح کے لیے محقق واکر لکھتا ہے کہ اگرچہ لگان اور سود (ان کا فرق پہلے واضح ہو چکا ہے) میں بڑا فرق ہے، تاہم منافع اور لگان ایک ہی جنس کی دو نوعیں ہیں۔ جس طرح لگان کی مقدار بہ سبب زمین کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کا کسی خاص مناسب مقام پر واقع ہونا ہے۔ اسی طرح منافع کی مقدار بھی کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی غیر معمولی انتظامی قوت و عاقبت اندیشی پر انحصار رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح مقدم الذکر کی تعیین میں مختلف زمینوں کے لگانوں کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے اسی طرح مختلف کارخانہ داروں کے منافع کی مقدار کے معین کرنے میں بھی ان کے اوصاف کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے۔ جس طرح بعض ایسی زمینیں ہیں جو کم لگان ادا کرتی ہیں، اسی طرح بعض ایسے کارخانہ دار بھی ہیں جو کم منافع حاصل کرتے ہیں۔ ہر ملک میں سینکڑوں ایسے تاجر یا کارخانہ دار ہیں جو حقیقت میں ان اوصاف سے بے بہرہ ہیں جو کارخانہ داروں کے لیے ضروری ہیں اور جن کا منافع بمشکل ان کے گزارہ کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اقتصادی استدلال کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے کارخانہ داروں کو منافع کچھ نہیں ہوتا۔ اس توضیح سے حقیقت منافع کے متعلق دو نہایت اہم نتائج نکلتے ہیں جن کو ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔

(۱) منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے، بلکہ یہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی غیر معمولی قوت انتظام کی وساطت سے پیدا ہوتی ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے، بلکہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو زمین کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کے کسی خاص مقام پر واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جس استدلال کی بنا پر یہ بات لگان کے متعلق صحیح ثابت کی گئی تھی، اسی استدلال کی رو سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے۔ صنعتی اشیاء کی قیمت اشیاء مذکور کے اس حصہ کے مصارف پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو، لیکن چونکہ اقتصادی اصولوں کی رو سے ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک وقت پر ایک ہی ہوتی ہے لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جو کارخانہ دار ان کارخانہ داروں کی نسبت جو نہایت نامساعد حالات میں کام کرتے ہیں کم مصارف پر اشیاء صنعتی تیار کر سکتے ہیں وہ منافع حاصل کریں گے کیونکہ قیمت اشیاء دونوں صورتوں میں

ایک ہی ہے اور مصارف پیدائش ایک صورت میں کم اور دوسری میں زیادہ ہیں۔

(۲) علیٰ ہذا القیاس یہ صحیح نہیں ہے کہ کارخانہ دار کا منافع صرف اسی صورت میں بڑھ سکتا ہے جبکہ اجرت کم ہو کیونکہ اجرت کی جو مقدار ان کارخانہ داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے مزین ہونے کے باعث منافع حاصل کرتے ہیں، وہی مقدار اوروں کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے جو ان اوصاف سے معرا ہونے کے باعث اقتصادی لحاظ سے کوئی منافع حاصل نہیں کرتے، یا صرف برائے نام منافع حاصل کرتے ہیں۔ اجرت کی مقدار دونوں میں مساوی ہے مگر ایک صورت میں منافع ہوتا ہے دوسرے میں کوئی منافع نہیں ہوتا، یا صرف برائے نام منافع ہوتا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ حصول منافع کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت کا نتیجہ ہے۔

جس طرح عمدہ زمینوں کا لگان بڑی زمینوں کے لگان سے مقدار میں زیادہ ہوتا ہے اس طرح ہوشیار اور معاملہ فہم کارخانہ داروں کا منافع ان کارخانہ داروں کے منافع سے زیادہ ہوتا ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے معرا ہوتے ہیں۔ آبادی و تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادنیٰ درجے کی زمینیں کاشت میں لانی پڑتی ہیں اور زرخیز قطعات زمین کا لگان بڑھتا جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جوں جوں ایسے کارخانہ داروں کی تعداد بڑھتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے معرا ہیں، توں توں ان کارخانہ داروں کا منافع بڑھتا ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں کیونکہ کارخانہ دار کی ناقابلیت کی وجہ سے مصارف پیدائش بڑھ جاتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کسی ملک کا تہذیب و تمدن میں ترقی کرنا اس امر کا مقتضی ہے کہ وہاں شرح منافع روز بروز کم ہوتے جانے کا میلان رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ملک میں ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کارخانہ داروں کا منافع روز بروز کم ہوتا جاتا ہے جو ذاتی قابلیت کا جوہر رکھتے ہیں کیونکہ ان کے منافع کی زیادتی ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد پر منحصر ہے۔ علاوہ اس کے ایسے ملک میں عام لوگ دور اندیش ہوتے جاتے ہیں، جس سے سرمایہ زیادہ سے زیادہ جمع ہو جاتا ہے لہٰذا اس کی رسد بڑھتی جاتی ہے اور شرح منافع کم ہوتی جاتی ہے کیونکہ شرح منافع کی زیادتی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ سرمایہ کی رسد کم ہو۔ مزید برآں تہذیب و تمدن کی ترقی سے آبادی بڑھتی ہے جس سے ادنیٰ درجے کی زرخیز زمینیں کاشت میں لانی پڑتی ہیں۔

لہذا مصارف پیدائش اور اشیاء خوردنی کی قیمت بڑھ جاتی ہے جس سے شرح منافع کی مقدار بھی کم ہو جاتی ہے مگر تم کہو گے کہ اگر یہ صحیح ہے تو انگلستان میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ شرح منافع پر کیوں بڑا اثر نہیں ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انگلستان کے سرمائے کا بہت سا حصہ غیر ممالک میں لگا ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خود انگلستان میں سرمائے کی رسد کم ہے۔ انگلستان میں دستکاری کی ترقی اور اشیائے خوردنی کی ارزانی کے باعث جو دیگر ممالک سے آئی ہیں مصارف محنت کی مقدار زیادہ نہیں ہوتی لہذا اس ملک میں شرح منافع میں نہایت خفیف کمی واقع ہوئی ہے۔

چونکہ دستکار بالعموم کارخانہ دار کے نفع کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس واسطے بعض محققین اقتصادی دستکاروں کے فائدے کو مدنظر رکھ کر یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر دستکار خود ہی محنتی ہو اور خود ہی کارخانہ دار ہو تو دستکاری کے موجودہ انتظام میں کارخانہ دار کا وجود ضروری نہ ہوگا اور وہ منافع جو موجودہ صورت میں کارخانہ دار کی جیب میں جاتا ہے دستکار کو ملے گا۔ یہ طریق اصول معاونت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

حوالہ:۔

(1) یہاں اصل نسخہ میں "اس" تھا۔ (مرتب)

باب چہارم

محنتی کا حصہ یا اجرت

پیداوار دولت کا چوتھا حصہ دار دستکار یا محنتی [1] ہے جس کا معاوضہ محنت اجرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے مگر پیشتر اس کے کہ ہم وہ اصول معلوم کریں جس کے عمل پر اجرت کی کمی بیشی کا انحصار ہے دو ضروری امتیاز ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں تاکہ مضمون زیر بحث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

(۱) ظاہری اجرت [2] سے زر نقد کی وہ مقدار مراد ہے جو بطور معاوضہ محنت کے ادا کی جائے۔ مگر حقیقی اجرت [3] سے مراد ان ضروریات زندگی یا دیگر اشیاء تن آسانی وغیرہ کی ہے جو اس زر نقد کی وساطت سے دستکار کو میسر ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ مختلف ممالک اور دستکاری کی مختلف شاخوں میں ظاہری اجرت کے مقادیر مساوی ہوں اور حقیقی اجرت کے مقادیر مندرجہ ذیل اسباب کے عمل سے مختلف ہوں۔

(ا) مختلف ممالک میں زر نقد کی قوت خرید مختلف ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ملک میں ۴ آنہ کے ایک سیر چاول بکتے ہوں، لیکن کسی اور ملک میں اس سکے کے عوض ۲ سیر چاول مل سکتے ہوں۔ لہٰذا اگر دونوں ملکوں میں کسی دستکار کی اجرت ۴ آنہ یومیہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں ۴ آنہ کی قوت خرید زیادہ ہے وہاں کے دستکاروں کی حقیقی اجرت بھی زیادہ ہے، اگرچہ ظاہری اجرت کی مقداریں دونوں ملکوں میں مساوی ہیں۔

(ب) مختلف ممالک میں ادائیگی اجرت کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض مقامات میں دستکار کے مکان کا کرایہ اس کی خورد و نوش کی چیزیں یا مرغزار میں مویشی چرانے یا ایندھن کی کوئی خاص مقدار لے لینے کا حق بھی اس کی ظاہری اجرت پر اضافہ ہوتا ہے۔ اس واسطے ممکن ہے کہ دو ملکوں میں کسی خاص قسم کے پیشہ وروں کی ظاہری اجرت مساوی ہو، لیکن ان کی ادائیگی اجرت کے مختلف دستور مروج

ہونے کی وجہ سے ایک میں حقیقی اجرت کی مقدار زیادہ ہو اور دوسرے میں کم۔ اکثر مغربی ممالک میں خاص خاص پیشہ وروں کو حق اجرت کے علاوہ بعض دیگر حقوق بھی حاصل ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ خصوصاً جب کہ مختلف ممالک کی مقادیر اجرت کا مقابلہ کرنا مقصود ہو۔

(ج) بعض پیشوں میں دستکار کی بی بی اور اس کے بال بچوں کو بھی ہاتھ بٹانے کا موقع مل جاتا ہے بلکہ اکثر صورتوں میں بی بی کی کمائی میاں کے مساوی ہو جاتی ہے۔ مثلاً بافندگی میں ایسا ہو سکتا ہے، لیکن بڑھئی اور کسان کا پیشہ اس قسم کا ہے کہ بی بی بال بچے ان کے کام میں حصہ نہیں لے سکتے۔

(د) بعض پیشے قدرتاً اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان میں دستکار اپنے کام کو بالتواتر جاری نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا ان پیشوں میں دیگر پیشوں کی طرح ایسا نہیں ہوتا کہ دستکار کو بالترتیب روز مرہ محنت کرنی پڑے۔ اس عدم تواتر کی کئی وجوہ ہیں۔

(۱) خاص خاص پیشوں کی قدرتی ضروریات۔

(۲) موسم کا اثر۔

(۳) بعض تمدنی اسباب۔

(۴) بعض اسباب جو خود دستکاروں کے طرز عمل سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً جب وہ کارخانہ داروں سے زیادہ اجرت لینے کی خاطر کاروبار چھوڑ دیتے ہیں اور کئی کئی دنوں تک بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ فن زراعت میں اجرت کی شرح مختلف موسموں میں مختلف ہوتی ہے۔ بسا اوقات سال کی تیسری سہ ماہی میں پہلی سہ ماہی کی نسبت اجرت کی شرح اول دو اسباب کے عمل سے دگنی ہو جاتی ہے مگر اس اختلاف کا باعث صرف موسموں کا تغیر ہی نہیں ہے بلکہ فن زراعت کی قدرتی ضروریات بھی کچھ ایسی ہی واقع ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ پیشہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کسان بیج بونے کے بعد اس کے اگنے تک انتظار کریں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض پیشوں میں اختلاف اجرت صرف اختلاف موسم کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً اینٹیں بنانا اور مکانوں پر نقش و نگار کرنا ایسے کام ہیں کہ ان کی ضرورت ہر روز اور ہر موسم میں نہیں پڑتی۔ ان تمدنی اسباب میں جو مختلف ممالک میں پیشوں کے تواتر محنت پر اپنا اثر کرتے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ بعض ممالک میں بعض تہوار اور مذہبی رسومات کئی کئی دن تک رہتے ہیں بلکہ اکثر ممالک میں تہوار کی تعداد سال میں سو دن سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ پس یہ تمام اسباب مختلف ممالک

اور مختلف پیشوں میں دستکاری کی حقیقی اجرت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں، خواہ ان کی ظاہری اجرت کی شرح مساوی ہی کیوں نہ ہو۔

(ر) بعض ممالک اور بعض پیشوں میں دستکار بہ نسبت دیگر ممالک اور دیگر پیشوں کے زیادہ عمر تک زندہ رہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر دو دستکار ایک ہی عمر میں اور ظاہری اجرت کی ایک ہی مقدار کے عوض میں بارآور طور پر محنت کرنا شروع کریں تو وہ دستکار جو زیادہ عمر تک زندہ رہے گا حقیقی اجرت کی زیادہ مقدار حاصل کرے گا۔

(۲) دوسرا امتیاز جس کا ذہن نشین کرنا لازم ہے۔ اجرت یا ظاہری مصارف محنت اور حقیقی مصارف محنت کے درمیان ہے۔ ظاہری مصارف محنت سے مراد اجرت کی وہ مقدار ہے جو کارخانہ داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کی کمی بیشی ضروریات زندگی یا اشیاء تن آسانی وغیرہ کی اس مقدار کی کمی بیشی پر منحصر ہے جو دستکار کو اپنی اجرت کے عوض میں میسر ہو سکے، لیکن حقیقی مصارف محنت کی مقدار اس معاوضے کی مقدار پر منحصر ہے جو کارخانہ داروں کو دستکاروں کے کام پر لگانے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ادائیگی اجرت کے عوض میں ملتی ہے۔ خواہ ظاہری مصارف محنت یا اجرت کی مقدار جو وہ اپنے دستکاروں کو ادا کرتا ہے، کم ہو یا زیادہ۔

ممکن ہے کہ کارخانہ کو ظاہری مصارف محنت یا اجرت کی ایک بہت بڑی مقدار ادا کرنی پڑے مگر حقیقی مصارف محنت دستکار کی ہنرمندی اور اس کی محنت کی کارکردگی وغیرہ کی وجہ سے کم ہوں۔ برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کارخانہ دار اجرت کی ایک ایسی قلیل مقدار ادا کرے جو بمشکل دستکاروں کے گزارے کے لیے کافی ہو۔ مگر سستی، غفلت، بے ہنری اور بھدا کام کرنے کے باعث ان کی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے اجرت کی وہ مقدار بھی کارخانہ دار کے پلے نہ پڑے، جو اس نے ادا کی ہے۔ کاریگر کفش دوز جو زیادہ اجرت لیتا ہے، چمڑے کی کتر بیونت اس ذکاوت سے کرتا ہے کہ ایک گز کے چار جوڑے بوٹ بنا لیتا ہے مگر بے ہنر کفش دوز اسی قدر چمڑے کے تین جوڑے بھی مشکل سے بنا سکتا ہے۔ لہٰذا مقدم الذکر کو کام پر لگانے سے کارخانہ دار کو منافع ہوگا اور موخر الذکر کو کام پر لگانے سے نقصان۔ یا یوں کہو کہ پہلی صورت میں کارخانہ دار کے حقیقی مصارف محنت کم ہوں گے اور دوسری صورت میں زیادہ۔ فرض کرو کہ دو کفش دوز ہیں جن میں سے ایک کی یومیہ اجرت ایک روپیہ ہے مگر پہلے

کا بنایا ہوا بوٹ جس پر لاگت ایک روپیہ آتی ہے اس کی کاری گری کی وجہ سے چار روپے قیمت پاتا ہے اور دوسرے کا بنایا ہوا بوٹ جس پر کہ کم درجے کا کاری گر ہونے کی وجہ سے ایک روپیہ چار آنے لاگت آتی ہے تین روپیہ قیمت پاتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ایک روپیہ اجرت ادا کرنے کا معاوضہ دستکار کے بھدا کام کرنے کے باعث صرف ۱۲ آنے ہے۔ ظاہری مصارف محنت دونوں صورتوں میں مساوی ہیں۔ تاہم پہلی صورت میں دستکار کی ہنر مندی کی وجہ سے حقیقی مصارف کم ہیں اور دوسری صورت میں دستکار کے کم درجہ کا کاری گر ہونے کے باعث زیادہ ہیں۔ کیونکہ پہلی صورت میں ایک روپیہ اجرت دینے کا معاوضہ دو روپیہ ملتا ہے اور دوسری صورت میں صرف ۱۲ آنے۔ غالباً یہ صحیح ہے کہ زیادہ سے زیادہ اجرت پانے والے دستکار وہی ہوتے ہیں جن کی محنت سے کارخانہ دار کو حقیقی مصارف محنت کی کم سے کم مقدار ادا کرنی پڑے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کارخانہ دار اپنے دستکاروں کی تعداد کو کم کرنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے بالعموم انہیں دستکاروں کو چھٹی دیتے ہیں جن کی اجرت سب سے کم ہو۔ کیونکہ ان کی محنت سے حقیقی مصارف محنت کی مقدار بڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ جن قوموں میں حقیقی اجرت کی شرح نہایت قلیل ہوتی ہے، بالعموم وہی قومیں اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ دیگر ممالک کی تیار شدہ اشیاء پر جہاں اجرت کی مقدار بہت زیادہ ہے اس قدر محصول لگادیں کہ وہ ان کے ملک میں بک نہ سکیں۔ ہندوستان میں روئی کاتنے والی کی اجرت بوجہ اس کے بھدا کام کرنے کے ایک روپیہ چار آنے فی ہفتہ ہے مگر انگلستان میں ایسے دستکار کی اجرت بوجہ اس کی کاریگری کے فی ہفتہ پندرہ روپیہ ہے۔ اس واسطے موخر الذکر ملک میں مقدار اجرت کے زیادہ ہونے کے باعث حقیقی مصارف محنت کی مقدار بہت کم ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ وہاں کے کارخانہ دار اپنی تیار کردہ اشیاء کو دیگر ممالک میں کم قیمت پر بیچ کر بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستانی کپڑے کی کثیر مقدار آتے رہنے کے باعث ہمارے دیسی کپڑے کی تجارت معدوم ہوگئی ہے کیونکہ ہمارے ملک میں بہ سبب کمی اجرت حقیقی مصارف محنت کی مقدار بہت زیادہ ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ ہمارے کارخانہ دار انگریزی کارخانہ داروں کی طرح کم قیمت پر کپڑا بیچ کر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس واسطے مجبوراً تجارت کی اس شاخ کو ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انگلستان کے کپڑے پر محصول لگایا جائے تا کہ ہمارے ملک کی اپنی صنعت کو ترقی ہو۔ انگلستان کا کپڑا نفیس بھی ہوتا ہے اور سستا بھی اس واسطے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسے کپڑے کے سامنے

ہندوستان میں کپڑے کی صنعت چمک سکے، جہاں کے دستکار بھدا کام کرنے والے ہیں اور جہاں کے کارخانہ داروں کو حقیقی مصارف محنت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ادا کرنی پڑتی ہے؟

اس توضیح کے بعد ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مقدار اجرت کی کمی بیشی کس بات پر منحصر ہے۔ اکثر انگریزی محققین اس بات پر متفق ہیں کہ کل سرمائے کا کچھ حصہ ادائیگی اجرت کے لیے علیحدہ نکال کر رکھ لیا جاتا ہے جس کی مقدار ہر ملک میں اقتصادی اسباب کے عمل سے قدرتاً معین ہو جاتی ہے۔ سرمایہ کی یہ معین مقدار سرمایہ اجرت [4] کہلاتی ہے اور مختلف دستکاروں پر مقابلے کے اثر سے منقسم ہوتی ہے۔ اگر ایک دستکار کو زیادہ اجرت ملتی ہے تو ضرور ہے کہ دوسرے کو کم ملے اور اس واسطے ہر دستکار کی اجرت بحساب اوسط سرمایہ اجرت کی مقدار اور تعداد دستکاروں کی درمیانی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔ یعنی اگر سرمایہ اجرت کی مقدار زیادہ ہے اور دستکاروں کی تعداد کم تو دستکاروں کو زیادہ اجرت ملے گی اور اگر سرمایہ اجرت کی مقدار کم ہے اور دستکاروں کی تعداد زیادہ تو ان کی اجرت کم ہو گی۔ پس ان حکماء کے نزدیک سرمایہ اجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد سے بالکل متاثر نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک ایسی مقدار ہے جو اقتصادی اسباب کے عمل سے ہر ملک میں خود بخود معین ہو جاتی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ اگر کسی ملک میں دستکاروں کی تعداد بڑھ گئی ہے تو سرمایہ اجرت کی مقدار بھی بڑھ جائے۔ غرض کہ یہ حکماء لگان اور اجرت کو نکال کر پیداوار دولت کے باقی حصے کو اس شخص کا حق قرار دیتے ہیں جو ساہوکار بھی ہو اور کارخانہ دار بھی۔

مگر امریکہ کے مشہور محقق واکر اس مسئلہ کی نہایت زور سے تردید کرتے ہیں اور انگریزی محققین کی تحریروں پر مندرجہ ذیل اعتراض کرتے ہیں۔

(۱) یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اجرت ہر حالت میں سرمائے کی مقدار میں سے ادا کی جائے جو کارخانہ کے پاس پہلے سے جمع ہو۔ انگریزی محققین کا یہ مسئلہ صرف انگلستان کے حالات اقتصادی کے مشاہدے کا نتیجہ ہے، جہاں سرمائے کی بہت سی مقدار پہلے سے جمع تھی اور جہاں دستکاروں کی اجرت گزشتہ سالوں میں اس قدر خفیف رہی ہے کہ ان کو روزمرہ کی ضروریات زندگی کے لیے مجبوراً اپنے کارخانہ دار کا منہ تکنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ بہ سبب کم استطاعتی اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت تک انتظار نہ کر سکتے تھے۔ صوبجات متحدہ امریکہ میں چونکہ دستکاروں کی مالی حالت اچھی ہے اس واسطے کارخانہ دار اشیاء کی فروخت کے بعد

اجرت ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ وہاں کے دستکار اپنی اپنی ضروریات کے مطابق فروخت اشیاء سے پہلے بھی اپنی اجرت کا کچھ حصہ لے سکتے ہیں۔

(۲) اگر کارخانہ دار اپنے دستکاروں کو روزا اجرت دے بھی دیا کریں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اجرت کی مقدار سرمایہ اجرت کی مقدار سے معین ہوتی ہے کیونکہ کارخانہ دار اپنا موجودہ سرمایہ خرچ کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے لگاتا ہے۔ جس سے اس کو منافع کی توقع ہوتی ہے۔ یہ دولت جو دستکاروں کی محنت سے پیدا ہوئی ہے زیادہ ہو تو کارخانہ دار مذکور اجرت بھی زیادہ ادا کر سکے گا اور اگر اس کی مقدار کم ہو تو وہ اپنے نفع کے خیال سے اجرت بھی کم ادا کر سکے گا۔ لہٰذا اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیداوار محنت کی قدر پر منحصر ہے۔ جس قدر اس کی پیداوار محنت کی قدر زیادہ ہوگی یا یوں کہو کہ جس قدر دستکار اپنی محنت کی کارکردگی اور ہنر مندی کی وجہ سے مزید دولت پیدا کرے اسی قدر اس کی اجرت بھی زیادہ ہوگی۔ پس اجرت حقیقت میں دستکار کی پیداوار محنت میں سے ادا کی جاتی ہے نہ کہ[5] سرمایہ اجرت میں سے جو کارخانہ دار کے پاس موجود ہو۔

(۳) چونکہ دلیل مندرجہ بالا کے مطابق اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیداوار محنت کی مقدار سے متعین ہوتی ہے اس واسطے ظاہر ہے کہ اگر پیداوار محنت کی مقدار زیادہ ہوگی تو دستکاروں کی اجرت بھی زیادہ ہوگی اور اگر اس کی مقدار کم ہوگی تو اجرت بھی کم ہوگی۔ لہٰذا اجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتی ہے مثلاً اگر زرعی دستکاروں کی تعداد بڑھ جائے اور زمین کی کاشت ابھی نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ انقسام محنت کی وجہ سے پیداوار محنت کی مقدار بہت زیادہ ہو جائے گی۔ (یہ کوئی ضروری نہیں کہ پیداوار محنت کی مقدار میں اسی نسبت سے زیادہ ہو جس نسبت سے کہ دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہوئی ہے۔ بلکہ جب زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو تو دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہو جانے کے باعث انقسام محنت زیادہ مکمل طور پر عمل کرتا ہے۔ اس واسطے پیداوار محنت کی مقدار اس نسبت سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے) اس صورت میں چونکہ پیداوار محنت کی مقدار بڑھ گئی ہے اس واسطے ممکن ہے کہ دستکاروں کی اجرت بھی بڑھے اور سرمائے کی مقدار میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی ہے تو

صاف ظاہر ہے کہ دستکاروں کی زیادتی سے پیداوار محنت فی کس کم ہو جائے گی۔ لہٰذا اجرت فی دستکار بھی کم ہو گی خواہ سرمائے کی مقدار میں زیادتی ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا وجہ سے محقق موصوف انگریزی حکماء کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا اور اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ ان کے خیال کو صحیح سمجھنا اور یہ تسلیم کر لینا کہ دستکاروں کی اجرت سرمایہ اجرت میں سے ادا کی جاتی ہے گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ دستکاروں کا ہنرمندی، دیانت داری اور دیگر اوصاف میں ترقی کرنا اگرچہ ان کی پیداوار محنت کو زیادہ کرتا ہے تاہم ان کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ کیونکہ ان کی اجرت سرمائے کی ایک معین مقدار سے ادا کی جاتی ہے اور اجرت کی کمی بیشی اس مقدار کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے۔ انگریزی حکماء یہ سمجھتے ہیں کہ پیداوار دولت میں لگان اور اجرت کو نکال کر باقی جو کچھ بچتا ہے وہ اس شخص کا حق ہے جو ساہوکار بھی ہو اور کارخانہ دار بھی مگر محقق واکر کے نزدیک اجرت کی بحث لگان، سود اور منافع کی بحث کے بعد آتی ہے۔ کیونکہ اجرت پیداوار دولت کی اس مقدار کے برابر ہے جو تینوں مذکورہ حصوں کو نکال کر باقی بچے۔ لگان کی کمی بیشی اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتی اور نہ لگان کی مقدار دستکاروں کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے۔ اس واسطے دستکار لگان کے کسی حصے کا حق دار نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سود چونکہ استعمال سرمایہ کا معاوضہ ہے اور اس کی کمی بیشی ان لوگوں پر اثر کرتی ہے جو دولت کے جمع کرنے والے ہوں۔ لہٰذا دستکار کو بحیثیت دستکار ہونے کے شرح سود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ منافع بھی لگان کی طرح اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتا اور نہ اس کی مقدار کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے۔ لہٰذا یہ تینوں حصے لگان، سود اور منافع دستکاروں کی اجرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے اور یہ ضروری ہے کہ اجرت دستکاروں کا اندازہ لگانے کے لیے پیداوار دولت کی کل مقدار میں سے پہلے ان کو وضع کر لیا جائے۔ اگر اشیاء کی قیمتوں پر ان کا اثر ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ دستکار کی اجرت بھی ان سے متاثر ہوتی۔ کیونکہ حقیقی اجرت سے مراد ان ضروریات زندگی یا دیگر اشیاء سے ہے جن کو دستکار زر نقد کی وساطت سے خرید کر سکیں۔ مگر چوں کہ اجرت پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اس واسطے محقق مذکور کے نزدیک تینوں حصوں یعنی لگان، سود اور منافع کو نکال کر دولت کی پیداوار میں سے جو کچھ باقی بچے وہ دستکار کا حق ہے۔ کیونکہ ہر سبب جو پیداوار محنت کی مقدار کو زیادہ کرتا ہے حقیقت میں دستکار کے حصے کو زیادہ کرتا ہے۔ تم شاید کہو گے کہ پیداوار محنت کی زیادتی سے زمیندار، ساہوکار اور کارخانہ دار کا حصہ کیوں نہیں بڑھتا۔ اس سوال کے جواب کے لیے فرض کرو کہ دستکار اپنے کام میں

نسبتاً زیادہ چست اور کاری گر ہو گئے ہیں جس سے پیداوار محنت کی مقدار بھی زیادہ ہو گئی ہے اور وہ مصالح بھی کم خرچ ہوتا ہے، جس سے اشیاء تجارتی تیار ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کس کا حق ہے؟ زمیندار کا؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کیونکہ اس مصالح میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی، جس کو زمین سے نکال کر اشیاء تجارتی کی تیاری میں صرف کیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار وہی ہے جو پہلے صرف ہوا کرتی تھی بلکہ دستکاروں کی کفایت شعاری کی وجہ سے نسبتاً کم ہو گئی ہے۔ لہٰذا مصالح مذکور کی مانگ میں کوئی تغیر نہ آنے کی وجہ سے ادنیٰ درجہ کی زمینوں کو کاشت میں نہیں لانا پڑتا، جس سے لگان یعنی زمیندار کے حصے کی مقدار میں اضافہ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ زیادتی ساہوکار کا بھی حق نہیں ہے۔ کیونکہ سرمائے کی مانگ بدستور وہی ہے جو پہلے تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ شرح سود یعنی ساہوکار کا حصہ نسبتاً بڑھ جائے جب کہ سرمائے کی مانگ میں کوئی اضافہ نہ ہو بلکہ دستکاروں کا کاری گری میں ترقی کرنا ساہوکار کے حصے کو الٹا کم کرتا ہے۔ کیونکہ کاری گر دستکار کو بالعموم اشیاء تجارت کی تیاری کے لیے اس قدر اوزاروں کی ضرورت نہیں ہوتی جس قدر کہ بھدا کام کرنے والے بے ہنر دستکار کو۔ کاریگر تھوڑے اوزاروں کی مدد سے بھی اپنا کام بخوبی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ مجموعی طور پر سرمائے کی مانگ کو کم کرتا ہے یا بالفاظ دیگر شرح سود کو کم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مقدار کو استعمال میں لائے جانے سے بچاتا ہے جو بصورت دیگر اوزاروں کے بنانے میں صرف کرنی پڑتی۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کارخانہ دار کا حق بھی نہیں ہے کیونکہ کارخانہ دار کا حصہ یا منافع صرف اسی صورت میں زیادہ ہو سکتا ہے جبکہ کارخانہ داروں کی تعداد میں زیادتی ہو (یہ بات پہلے ثابت ہو چکی ہے) اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ دستکاروں کا کاریگری میں ترقی کرنا کارخانہ داروں کی زیادتی تعداد کا مستلزم ہو۔ بلکہ دستکاروں کے ہنر اور کاریگری میں ترقی کرنے سے لیاقت انتظامی کا معیار بڑھ جاتا ہے جس سے ناقابل کارخانہ داروں کا وجود معطل ہو جاتا ہے اور وہ دائرہ تجارت سے روز بروز خارج ہوتے جانے کا میلان رکھتے ہیں جس کے یہ معنے ہیں کہ کارخانہ داروں کی تعداد کم ہو جانے کے باعث ہوشیار اور قابل کارخانہ داروں کا منافع کم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ پیداوار محنت کی زیادتی جو دستکاروں کی ذاتی ترقی سے پیدا ہوتی ہے، خود دستکاروں کا حق ہے، زمینداروں، ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

حوالہ جات:-

(1) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے مصنف نے مزدور (Labourer) کے لیے "محنتی" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔(مرتب)

(2) Nominal Wages(مرتب)

(3) Real Wages(مرتب)

(4) مراد ہے Wage Fund ۔(مرتب)

(5) یہاں "کہ" رہ گیا تھا جو بڑھا دیا گیا ہے۔(مرتب)

باب پنجم

مقابلہ دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے

اگر چہ موجودہ تمدن میں دستکار نظری لحاظ سے پیداوار دولت کی اس تمام مقدار کا مالک ہے جو زمیندار، ساہوکار اور کارخانہ دار کا حصہ نکال کر باقی رہتی ہے، تاہم بعض اسباب کے عمل سے دستکاروں کو انتہا درجے کا نقصان پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنا پورا حصہ حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

(۱) بسا اوقات دستکاروں میں شادیوں کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ چند سالوں میں ان کی آبادی دگنی ہو جاتی ہے۔ جس سے پیداوار محنت کی مقدار فی کس کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ افزائش آبادی کے باعث روز بروز ادنیٰ درجے کی زمینوں کو مجبوراً کاشت میں لانا پڑتا ہے۔ فرضاً اگر پہلے بیس دستکاروں کی پیداوار محنت چالیس من غلہ ہو، تو ان کا حصہ فی کس دو من ہوگا، لیکن اگر دستکاروں کی تعداد چالیس ہو جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کا حصہ فی کس صرف ایک من رہ جائے گا۔

(۲) علیٰ ہذا القیاس اصول مقابلہ کے کامل طور پر عمل نہ کرنے کے باعث بھی دستکار نقصان اٹھاتے ہیں۔ بالعموم دستکار نقل مکانی کی تکلیف گوارا کر کے ایسے مقامات میں جانا نہیں پسند کرتے جہاں شرح اجرت کی مقدار زیادہ ہو بلکہ جس جگہ حالات نے [1] لا پھینکا وہیں پڑے رہتے ہیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ تمام اشیاء نقل مکانی کر سکتی ہیں مگر انسان ایک ایسی چیز ہے کہ بڑی مشکل سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک حرکت کرتا ہے۔ البتہ بعض ممالک میں جہاں کے لوگ قدرتاً چست اور اپنی حالت کو سنوارنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، دستکار آزادی سے نقل مکان کرتے ہیں۔ جس سے مختلف جگہوں اور مقاموں کے دستکاروں کے درمیان اصول مقابلہ پورے طور پر عمل کرتا ہے اور اجرت کے مقادیر میں

کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں دستکار اپنے پیشوں کو تبدیل کرنے سے بھی بالعموم گھبراتے ہیں۔ اس غفلت یا کاہلی کی وجہ سے انہیں بسا اوقات ایسے پیشوں میں روزگار تلاش کرنا پڑتا ہے جہاں دستکاروں کی مفلسی کے اور اسباب کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ تبدیل پیشہ ایک قسم کا طعن تصور کیا جاتا ہے۔ اگر کسی درزی سے کہو کہ اپنے بیٹے کو کفش دوزی یا آہن گری کا کام سکھلائے، کیونکہ اس کام میں بوجہ قلت افراد دستکاروں کی اجرت کی مقدار زیادہ ہے تو اس بات سے وہ گھبراتا ہے اور آہن گری یا کفش دوزی کو اپنی ذات کے خلاف سمجھتا ہے۔ مگر مقام شکر ہے کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے یہ تمدنی نقص اب روز بروز دور ہو رہا ہے۔

اگر مقابلہ ہر طرح سے کامل ہو اور پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو، تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے اثر سے ہر دستکار اپنے ہنر کے مطابق اجرت پائے گا، جو شخص جس کام کی قابلیت قدرتاً رکھتا ہوگا وہی کام اس سے لیا جائے گا اور نظام تمدن میں ہر فرد کے فرائض وہی ہوں گے جو ہونے چاہئیں۔ دستکاروں کی حالت میں ایک قسم کی مساوات قائم ہو جائے گی اور وہ تمام نقصان جو مقابلہ ناکامل [2] کی صورت میں دستکاروں کو پہنچتے تھے دور ہو جائیں گے۔ ہم پہلے اشارتاً بیان کر آئے ہیں کہ مقابلے سے مراد اس تجارتی رقابت کی ہے جو انسان کی فطری خودغرضی کی وجہ سے کسی شے کے خریدنے اور بیچنے والوں کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات ناگوار سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کشش ثقل کی وجہ سے اجرام فلکی کے درمیان ایک قسم کا نظام قائم ہے، اسی طرح مقابلہ بھی ایک قسم کی کشش ہے، جس کے عمل سے صنعت و حرفت کے عالم میں نظام قائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مقابلے کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اسی شاخ میں کام کرے گا جہاں اسے اجرت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ملتی ہے، تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کا فائدہ صرف اس کی ذات تک محدود ہے بلکہ اگر دوسرے پہلو سے دیکھو تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مقابلے کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اس شاخ میں پہنچ جائے گا جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔ اگر تجارت کی کسی ایک شاخ میں کام کرنے سے کسی دستکار کی تیار کردہ شے بہ نسبت دیگر شاخوں کے زیادہ قیمت پاتی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ تجارت کی اس خاص شاخ میں بہ نسبت دیگر شاخوں کے اس دستکار کی مانگ زیادہ ہے۔ اگر وہ اس شاخ کو چھوڑ کر کسی اور شاخ میں چلا جائے تو نہ صرف نقصان اٹھائے گا بلکہ اس کی حرکت سے اوروں کو بھی نقصان پہنچے گا۔ علاوہ بریں مقابلہ کامل کے عمل سے قدرتی اور دیگر حوادث (مثلاً قومی سرمایہ کا عظیم الشان جنگلوں میں

صرف ہو جانا، فصل نہ ہونا، آتش زدگی، طوفان، وغیرہ) کا اثر دستکاروں پر مساوی طور پر منقسم ہوتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ مقابلہ کامل دستکار کا محافظ ہے اور ان کو بحیثیت مجموعی اس بربادی اور تباہی سے بچاتا ہے جو اس قسم کے حوادث کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ تم جو کے ایک ڈھیر پر زور سے ایک پتھر مارتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم اس صدمہ سے جو کے ایک منفرد دانے کو بھی نہیں کچل سکتے کیونکہ دانے ادھر ادھر ہو جائیں گے اور پتھر ڈھیر کے اندر گھس جائے گا۔ برخلاف اس کے اگر تم ڈھیر میں سے ایک جو کو لے کر اس کے اوپر پتھر مارو، تو یہ دانہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ یہی سوال دستکاروں کا ہے۔ اگر ڈھیر کے دانوں کی طرح ان کی حرکت بھی آزاد نہ ہو اور یہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک پیشہ سے دوسرے پیشہ میں بلاقید منتقل ہو سکتے ہوں تو حوادث کا اثر چونکہ سب پر مساوی تقسیم ہو جائے گا اس واسطے کسی فرد واحد کو چنداں محسوس نہ ہو گا اور سب کے سب افراد محفوظ رہیں گے اور مزید برآں ایسے اسباب فی الفور اپنا عمل شروع کر دیں گے جن کے اثر سے وہ کمی پوری ہو جائے گی جو ان ناگہانی حوادث سے پیدا ہوئی ہو۔ غرض کہ مقابلہ کامل اور دیگر اقتصادی اسباب کا عمل دستکاروں کی تمدنی حیثیات کے درمیان ایک قسم کی ایسی مساوات اور ایک طرح کی ایسی یگانگت، ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرنے کی طرف میلان رکھتا ہے جس کے ساتھ تجارت کی ہر شاخ کی ترقی اور توسیع وابستہ ہے۔

لیکن چونکہ نفس الامر میں ایک قسم کا کامل مقابلہ کسی ملک کے دستکاروں کے درمیان نہیں ہے اس واسطے نظام تمدن کی موجودہ صورت میں دستکاروں کی حالت بالعموم اچھی نہیں ہے۔ موجودہ ناکامل حالت اس امر کی مقتضی ہے کہ اقتصادی اسباب کا اثر دستکاروں کا موید نہ ہو بلکہ مخالف ہو جو مصیبت کا مارا زندگی کی دوڑ میں ایک دفعہ منہ کے بل گر گیا وہ پھر اٹھ نہیں سکتا اور موجودہ حالت میں ایسے اسباب بھی موجود نہیں جن کا عمل اس بدقسمت کو سہارا دے کر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ جب کوئی دستکار بے روزگار ہو کر مفلس ہو جاتا ہے تو بالعموم (3) فطری خودداری اور ہم چشموں کی نگاہوں میں وقعت پیدا کرنے کی آرزو اس پر کوئی اثر نہیں کر سکتی جو قدرتاً انسان کو اوروں سے آگے بڑھ جانے کی ایک زبردست تحریک دیتی ہے۔ مفلسی کا آزار انسان کی روحانی قوئ کا دشمن ہے اور وہ مایوسی، فکر اور غفلت شعاری، کاہلی اور فلاکت کی اور صورتیں جو اس بلائے بے درمان کے ساتھ آتی ہیں دستکار کی ذاتی قابلیت اور اس کی محنت کی کارکردگی پر ایسا برا اثر کرتی ہیں کہ اس کے کام کی وہ کیفیت اور کمیت نہیں رہتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ ایک دفعہ کی شکست بے چارے دستکار کو ہمیشہ کے لیے کارزار زندگی کے ناقابل

کر دیتی ہے اور پھر یہ نہیں کہ اس شکست کا کچھ علاج ہو جائے بلکہ جدید اقتصادی اسباب کا عمل (مثلاً تجارت کی توسیع، محنت کی نئی شاخوں کا کھلنا اور ملک کی روز افزوں اقبال مندی) اس بیچارے کی حالت کو سدھار نہیں سکتا۔ لہٰذا موجودہ مقابلہ ناکامل کی صورت میں اقتصادی اسباب کا عمل اس طرف میلان رکھتا ہے کہ نظام صنعت میں افراد کا موجودہ اختلاف مدارج روز بروز بڑھتا جائے اور جس فرد یا جماعت کو کسی سبب سے آغاز ہی میں کوئی مصیبت دامن گیر ہوگئی اس کی حالت بدستور وہی رہے، بلکہ روز بروز ابتر ہوتی جائے۔ تمدن کی ایسی حالت میں ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر نظام صنعت مقابلہ کامل کی برکات سے خالی ہو تو اجرت کی مقدار کو بڑھانے اور دستکاری کی تمدنی حالت کو سنوارنے کے واسطے کیا وسائل اختیار کرنے چاہئیں؟

حکماء کا ایک طبقہ جس کو حکمائے متوکلین کے نام سے موسوم کرنا چاہیے، کہتا ہے کہ موجودہ نظام صنعت میں قوانین وغیرہ کی مدد سے کوئی دست اندازی نہیں کرنی چاہیے بلکہ اس کو تمام قانونی اور دیگر قیود سے آزاد کر کے اس بات پر اعتماد کرنا چاہیے کہ بالآخر جو کچھ ہوگا نوع انسان کے لیے اچھا ہو گا۔ یہ حکماء اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قانون کی مدد سے دستکاروں کی اجرت کا زیادہ کرنا برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کے ارکان سلطنت نے یہ قانون وضع کیا ہے کہ اجرت کی مقدار بیس فی صدی کے حساب سے زیادہ کر دینی چاہیے۔ اگر پیداوار محنت کی مقدار میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی تو صاف ظاہر ہے کہ کارخانہ داروں کو نقصان پہنچے گا اور وہ اپنا سرمایہ دیگر ممالک میں لگا دیں گے جہاں اس قسم کا کوئی قانون مروج نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر سرکار یہ قانون وضع کر دے کہ ہر دستکار آٹھ گھنٹہ یومیہ سے زیادہ کام نہ کرے گا تو ایک صریح ناانصافی ہوگی کیونکہ بعض پیشوں میں آٹھ گھنٹہ کام کرنا کوئی بات نہیں۔ مگر بعض پیشوں میں اتنے گھنٹہ یومیہ کام کرنا جسمانی صحت کے بالکل مخالف ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر بے روزگار دستکار کا حق ہے کہ سرکار اسے روزگار دے۔ بالفرض اگر ایسا ہو تو سرکار کو تنخواہ یا اجرت کی ادائیگی کے واسطے رعایا سے قرض اٹھانا پڑے گا اور مداخل ملکی میں کسی نہ کسی طرح زیادتی کرنی ہوگی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصے کے لیے یہ طریق عمل مفید ہوگا مگر اس کو مستقل طور پر اختیار کرنا انتہا درجے کا مضرت رساں ہے کیونکہ آبادی کی روز افزوں ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک تمام قانونی قیود محض بے سود ہیں مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی آزادی، قیود کے دور کرنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ بعض قیود ایسے ہوتے ہیں جن سے

انسان کی آزادی کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی تماشا گاہ میں آگ لگ جائے اور ہر شخص اپنے بچاؤ کے لیے وہاں سے بھاگے تو صاف ظاہر ہے کہ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگنے کی نسبت اگر تماشائی کسی خاص ترتیب کے پابند ہو کر وہاں سے نکلیں تو یہ طریق عمل زیادہ محفوظ ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قسم کے انتقال زمین کے لیے ایک خاص تحریر اور پھر اس تحریر میں خاص خاص قانونی اصطلاحوں کا استعمال ضروری ہے جو بظاہر ایک قسم کی قید ہے مگر حقیقت میں آزادی انتقال کو زیادہ کرتی ہے کیونکہ اس قسم کی قیود سے انتقال کنندہ کو ہر طرح کا اطمینان ہو جاتا ہے اور [4] کسی قسم کا شک وشبہ نہیں رہتا' جس کا بصورت عدم تحریر وغیرہ اس کے دل میں پیدا ہونا ممکن تھا۔ لہٰذا دستکاروں کی حالت کو سنوارنے کا سب سے احسن طریق یہ ہے کہ دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ہمدردی پیدا کی جائے اور یہ بات ان کے ذہن نشین کی جائے کہ قوم کی بہبودی تمام افراد کی بہبودی سے وابستہ ہے اور ایک رشتے کے ضعیف اور کمزور ہو جانے سے تمام قوم کا شیرازہ بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک طریق معاونت پر عمل کرنا بھی دستکاروں کے لیے مفید ہے۔ کیونکہ اس طریق سے وہ منافع جو کارخانہ داروں کی جیب میں جاتا ہے، دستکاروں کے قبضے میں آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر ممالک میں جا کر آباد ہونا بھی دستکاروں کی بہبودی پر ایک نمایاں اثر کرتا ہے کیونکہ اس کی وساطت سے کسی ایک ملک میں ان کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں سے قریباً بارہ لاکھ دستکار اس وقت جزائر میں آباد ہیں، جہاں ان کی حالت بہت اچھی ہے، لیکن ابھی ہندوستان کے دستکاروں کو نقل مکانی کی بہت ضرورت ہے مگر ہمارے نزدیک کی اجرت کا مفید ترین نسخہ قومی تعلیم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے دستکار کا ہنر، اس کی محنت کی کارکردگی اور اس کی ذہانت ترقی کرتی ہے، اس کے اخلاق سنورتے ہیں، اور وہ اس قابل بنتا ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ تعلیم کی مدد سے دستکار اپنے کام کو سہولت کے ساتھ کر لینے کی راہیں سوچ سکتا ہے اور جدید کلوں کا استعمال جلد سیکھ سکتا ہے اور شراب خوری اور ہر قسم کی غلط کاری سے محفوظ رہتا ہے، جو بالعموم جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

حوالہ جات:۔

(1) یہاں اصل نسخے میں "نے" اور "کا" کے درمیان "ایک جگہ" لکھا تھا جسے حذف کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(2) Imperfect Competition (مرتب)

(3) یہاں نسخہ میں "بالعموم" کے بعد لفظ "وہ" تھا جسے حذف کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(4) یہاں اصل نسخے میں "اور" کے بعد لفظ "کوئی" تھا جسے حذف کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

باب ششم

سرکار کا حصہ یا مال گزاری

پیداوار دولت کی کچھ مقدار ایسی بھی ہے جو نہ زمیندار اور ساہوکار کے قبضے میں جاتی ہے نہ کارخانہ دار اور دستکار کے قبضے میں۔ یہ مقدار دو حصوں پر منقسم کی گئی ہے۔

(ا) اول وہ مقدار جو محصولات و مال گزاری کی صورت میں سرکاری خزانوں میں جاتی ہے۔ حکماء کے درمیان اس امر کے متعلق بڑا اختلاف ہے کہ آیا محصول سرکار کی بحث تقسیم دولت کے باب میں آنی چاہیے یا صرف دولت کے باب میں۔ کیا سرکار کو پیداوار دولت کا پانچواں حصہ دار تصور کرنا چاہیے یا صرف یہ سمجھنا چاہیے کہ زمیندار، ساہوکار، کارخانہ دار اور دستکار کے حصوں میں سے کچھ مقدار انتظام مملکت کے استحکام کے لیے سرکار کو ادا کی جاتی ہے۔ بعض حکماء کا یہ قول ہے کہ سرکار خود دولت پیدا کرتی ہے، مثلاً سڑکیں بنواتی ہے، پل تیار کرواتی ہے اور دیگر رفاہ عامہ کی صورتوں میں سرمایہ صرف کرتی ہے لہٰذا تقسیم دولت میں ایک خاص حصے کی حقدار ہے جو محصول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے بعض حکماء اس بات پر مصر ہیں کہ اکثر صورتوں میں سرکار کا سرمایہ غیر بارآور طور پر صرف ہوتا ہے۔ بڑی بڑی فوجیں اور جنگی جہاز رکھنے کی اصلی غرض یہ نہیں ہوتی کہ ملک میں امن وامان قائم ہو جس سے قوم کا ہر فرد مطمئن ہو کر اپنے کام میں لگا رہے بلکہ اس ساز وسامان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سلطنت کا دائرہ وسیع ہو، اور شاہی خاندان کو استحکام اور قوت حاصل ہو۔ علاوہ بریں ادائیگی محصول کوئی تبادلہ دولت کی قسم سے نہیں ہے کہ اپنی خوشی سے سرکار کو ایک شے دی اور کوئی اور شے اس کے عوض میں حاصل کر لی بلکہ رعایا کو مجبور کیا جاتا ہے کہ محصول کی کچھ نہ کچھ مقدار ادا کرے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر دو فریق راستی پر ہیں کیونکہ محصول سرکار کی بحث ایک اعتبار سے تقسیم اور دوسرے اعتبار سے صرف دولت کے ساتھ وابستہ ہے۔ سڑکوں، پلوں اور دیگر عمارات کی تعمیر جدید، تجارتی بندرگاہوں کا افتتاح،

محصول لگانے کے مختلف طریق اور اس کے جمع کرنے کے وسائل، اور نیز اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی خاص محصول زمین زمیندار کی ذاتی جیب سے نکلتا ہے یا حقیقت میں اس کے ادا کنندے پیداوار زمین کو استعمال میں لانے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ تمام اور اس قسم کے دیگر امور تقسیم دولت کی بحث میں آتے ہیں۔ برخلاف اس کے سرکاری اخراجات کے نتائج کا نیک و بد ہونا صرف دولت کی بحث میں آتا ہے۔

اگرچہ مال گزاری سرکار کی کئی صورتیں ہیں مگر اس باب میں ہم صرف دو بڑی صورتوں کا ذکر کریں گے جن پر غور کرنا ضروری ہے:-

(1) محصولات زمین۔

(2) محصولات آمدنی۔

قدیم الایام سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ فاتحین مفتوحوں کی پیداوار زمین میں سے کچھ حصہ وصول کریں اور مختلف زمانوں میں اس حصہ سرکار کی مقدار مختلف رہی ہے مگر یہ امر عام طور پر مسلم ہے کہ سرکار واقعی زمین کی خصوصیات کے لحاظ سے اس پر ایک خاص محصول لگانے کا حق رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک خاص میعاد کے بعد جس کی مقدار آج کل دن بدن زیادہ سے زیادہ ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ سرکاری طور پر زمینداروں سے محصول کی ایک خاص مقدار ادا کرتے رہنے کا ایک معاہدہ کیا[1] جاتا ہے جس کو بندوبست کہتے ہیں اور جس کی دو صورتیں ہیں۔

(۱) زمینداری یا تعلق داری اضلاع جہاں زمیندار خود مال گزاری ادا کرتا ہے خواہ زمین کی کاشت خود کرے خواہ اوروں سے کرائے۔

(۲) اضلاع رعیت داری جہاں مزارعین اپنی اپنی مال گزاری خود ادا کریں اور سرکار اور مزارع کے درمیان زمیندار کا واسطہ نہ ہو۔

آج کل ہندوستان میں بعض اہل الرائے مسئلہ مال گزاری پر بڑی گرمی جوشی کے ساتھ بحث کر رہے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے موجودہ افلاس و ادبار کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں سلسلہ بندوبست دوامی کو وسعت نہیں دی جاتی۔

دت صاحب جنہوں نے حال ہی میں سرکار ہند کے ساتھ اس اہم مضمون پر خط و کتابت کی ہے، فرماتے ہیں کہ بنگال میں بندوبست دوامی کے باعث دولت و اقبال نے ترقی کی ہے اور عام

لوگوں نے خاصہ سرمایہ جمع کرلیا ہے جو مختلف قسم کی صنعتوں میں صرف ہو سکتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ مذکورہ بالا محقق کا ذاتی تجربہ اور ان کی مسلمہ لیاقت بہت بڑی وقعت رکھتی ہے مگر ہماری رائے میں بنگال کی دولت و اقبال کا باعث صرف بندوبست دوامی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اور بھی اسباب ہیں جن کی طرف صاحب موصوف نے توجہ نہیں مبذول فرمائی۔ مشرقی بنگال خصوصیت سے زرخیز ہے اور ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ یہاں بارش بالکل نہ ہو، جیسا ہندوستان کے دیگر حصوں میں ہوتا ہے۔ علاوہ بریں صوبہ بنگال میں پٹ سن کی پیداوار ہوتی ہے جو ہندوستان میں کسی اور جگہ شاذ ہوتی ہے۔ مزید برآں ملک ہندوستان کے اس حصے میں وسائل آمدورفت بھی بہ نسبت دیگر مقامات کے کامل ہیں۔ باوجود ان باتوں کے ایک سال بارش نہ ہوئی تو بنگال میں ایک خوفناک قحط نمودار ہوا بلکہ یہا ں بندوبست کو دوامی کر دینے کا موذی اثر یہ ہوا کہ زمیندار جتنا چاہتے تھے لگان لیتے تھے اور اس طرح بیچارے کاشتکاروں پر بے جا ظلم وستم ہوتا تھا۔ ان حالات میں سرکار ہند مجبور ہوئی کہ مزارعین کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان کو زمینداروں کے ظلم سے بچائے۔ پس اس غرض کے حصول کے لیے سرکار ہند نے کئی قانون و قواعد وضع کیے لہٰذا ہمارے نزدیک بنگال کی اقبال مندی زیادہ تر اس صوبے کی جغرافی خصوصیات کی وجہ سے ہے اور کچھ ان قواعد کی وجہ سے ہے جو سرکار ہند نے مزارعین کے حقوق کی حفاظت کے لیے وقتاً فوقتاً وضع کیے ہیں۔ صوبہ بہار میں بندوبست دوامی کی وجہ سے لوگوں کو ۸۰ لاکھ روپیہ سالانہ کی رعایت ہے مگر باوجود اس بات کے گزشتہ تیس سال میں وہاں دو دفعہ قحط نمودار ہوا اور لوگ اس قدر رعایت کے ہوتے ہوئے بھی قحط کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پس یہ کہنا کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ رقم مال گزاری کا دوامی طور پر مقرر کر دیا جانا لوگوں میں قحط کا مقابلہ کر سکنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔

دوسری بڑی صورت مال گزاری سرکار کی محصولات آمدنی، یعنی وہ محصول جو آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔

اکثر حکماء نے محصولات آمدنی کے متعلق کئی اصول وضع کیے ہیں مگر چونکہ یہ عملاً کچھ بہت مفید نہیں ہیں اس واسطے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر ذکر کر دینا کافی ہوگا کہ انتظام مملکت کے استحکام کے لیے اس قسم کے محصولات کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں محصول آمدنی میں اصولاً ایک یہ نقص ضرور ہے کہ آرام طلب اور سست لوگ جو کچھ نہیں کماتے اس کی ادائیگی سے بچ جاتے ہیں اور اس کا سارا بار ملک کی آبادی کے اس حصے پر پڑتا ہے جو محنتی یا تجارت پیشہ ہوتا ہے۔

(ب) اکثر تجارتی ممالک میں بعض ایسے افراد ہوتے ہیں جن کی باریک بین نگاہ تجارت کی مدوجذر کو خوب پہچانتی ہے۔ یہ لوگ اصل معنوں میں نہ تاجر ہوتے ہیں نہ کارخانہ دار، نہ خوردہ فروش، نہ تھوک فروش، بلکہ بسا اوقات ان کے پاس اشیاء فروختنی کے بڑے بڑے ذخیرے بھی نہیں ہوتے۔ صرف اپنی باریک بینی اور تجربے سے معلوم کر جاتے ہیں کہ فلاں شے کی قیمت اتنے عرصے میں کم یا زیادہ ہو جائے گی اور اسی رائے کے بل پر اشیاء کی خرید و فروخت سے بالعموم فائدہ اور بسا اوقات نقصان بھی اٹھا لیتے ہیں۔ مثلاً جب یہ دیکھتے ہیں کہ غلے کی قیمت کچھ عرصے میں بڑھ جانے کو ہے تو جھٹ غلے کے سوداگروں کے ساتھ سودا کر لیتے ہیں اور پھر گرانی کے موسم میں بسا اوقات عظیم الشان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیداوار محنت کی ایک بہت بڑی مقدار ہر سال ان لوگوں کے ہاتھوں میں سے گزرتی ہے اور اس وجہ سے قومی دولت کا کچھ حصہ ان تاجر نما افراد کے قبضے میں جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک لحاظ سے گویا دولت کے چھٹے حصہ دار ہیں مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے تاجروں کا وجود بالکل غیر مفید نہیں ہے کیونکہ جو شخص اپنی باریک بینی اور تجربے کی وساطت سے مثلاً یہ معلوم کر لیتا ہے کہ فرضاً چار ماہ کے بعد غلے کی قیمت بہت بڑھ جائے گی اور اس رائے کی صحت کے بل پر غلہ خریدنا شروع کر دیتا ہے، وہ ایک طرح سے اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ غلے کی رسد زیادہ کرنے کے لیے باہر سے زیادہ غلہ لانا چاہیے۔ اور نیز موجودہ ذخیرے کو زیادہ کفایت شعاری سے برتنا چاہیے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر تجارت کی یہ صورت مناسب حدود کے اندر رہے، تو اس کی وساطت سے اشیاء کی مانگ اور رسد کے درمیان مساوات پیدا ہوتی ہے اور قیمت اشیاء کے ناگہانی تغیرات کا اثر زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

حوالہ:۔

(1) (حاشیہ از مصنف) پنجاب میں بالعموم حق ملکیت کی تین صورتیں ہیں

(i) زمینداری۔

(ii) پتی داری۔

(iii) بھیا چارہ۔

مقدم الذکر دو صورتوں میں تمام مالکان وہ مشترکہ طور پر مال گزاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور تیسری صورت میں ہر حصہ دار اپنے حصہ زمین کی مال گزاری ادا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ مالکان خود کاشت بھی ہوتے ہیں، جو اپنی مال گزاری فرداً فرداً خود ادا کرتے ہیں۔

حصہ پنجم

☆ آبادی
☆ جدید ضروریات کا پیدا ہونا
☆ صرفِ دولت

باب اول

آبادی

کسی شے کے صرف سے مراد اس شے کے استعمال سے ہے۔ صرف شے عدم محض کا مستلزم نہیں ہے۔ مثلاً جب اینٹوں کی ایک خاص تعداد کا پل بن جاتا ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ اینٹوں کی تعداد صرف ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس صرف سے اینٹیں بالکل فنا نہیں ہو جاتیں۔ تاہم لفظ صرف کے مفہوم میں فنا کا مفہوم شامل ہے اور صرف شے کے معنوں میں اس شے کا انعدام اور تبدیل ہیئت دونوں داخل ہیں۔

بعض حکماء یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دولت کی بحث مضامین اقتصاد میں داخل نہیں ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مورخین کے لیے اس علم کا مطالعہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہو سکتا ہے کہ اس کے اصول اور مسائل ان اسباب پر روشنی ڈالیں جن کے عمل سے مختلف اقوام عالم کا عروج و زوال ظہور میں آتا ہے اور اس جذر و مد کے باعث معلوم نہیں ہو سکتے جب تک کہ اقوام عالم کی دولت اور اس کو صرف کرنے کے مروج طریق نہ معلوم کیے جائیں۔ علیٰ ہذا القیاس ہم اپنی آئندہ نسلوں کی دولت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم خود کس قدر صرف کرتے ہیں اور کس طرح صرف کرتے ہیں۔ کسی قوم کی آئندہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر ضروری نہیں ہے کہ اس قوم کی موجودہ دولت کا اندازہ کیا جائے بلکہ زیادہ ضروری اس بات کا معلوم کرنا ہے کہ وہ قوم اپنی موجودہ دولت کو کس طرح صرف کرتی ہے اور اس کی عادات کس قسم کی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ اس کے دستکاروں کا ہنر اور ان کی محنت کی کارکردگی روز بروز بڑھتی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح صرف کرے کہ اس کے افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے جس سے مفلسی اور بیماری اور دیگر بدنتائج پیدا ہوتے جائیں۔ باوجود ان صریح دلائل کے ہمیں تعجب

ہے کہ بعض حکماء اس بحث کو مضامین اقتصاد میں داخل نہیں سمجھتے۔

(۱) دولت کا پہلا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار کو سامان معیشت، لباس اور جائے رہائش ملتی ہے تمدن کے ابتدائی مراحل میں دیگر حیوانات کی طرح انسان بھی صرف نباتات اور قدرتی پھل پھول پر گزارہ کرتا تھا مگر انسان کے تمدن کا حقیقی سلسلہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب اس نے آگ کے خواص اور اس کے طریق استعمال معلوم کر کے اپنی خوراک کو پکانا شروع کیا۔ علیٰ ہذا القیاس رفتہ رفتہ تمدنی ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ انسان برہنہ پہاڑوں کی غاروں اور درختوں کے پتوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہے اور بجائے ان کے لباس، جھونپڑیوں، چمڑے کے خیموں اور مکانوں کا استعمال سیکھے۔

(۲) دولت کا دوسرا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار رشتہ ازدواج کرتا ہے[1]۔ بی بی کی خواہش ایک فطری خواہش ہے اور یہ بالعموم ان خواہشوں کے پورا ہو چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے جن کا پورا ہونا انسان کے جسمانی بقا کے واسطے انتہا درجے کا ضروری ہے۔ مگر بی بی انسان کے بعض قدرتی تقاضوں کو ہی پورا نہیں کرتی بلکہ ابتدائے تمدن میں خاوند کو اپنے کاروبار میں مدد دیتی ہے اور اس طرح اس کی پیداوار محنت پر بڑا اثر کرتی ہے۔ اکثر قدیم قومیں ایک سے زیادہ بیبیاں کرنا مستحسن تصور کرتی تھیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور کچھ یہ کہ ہر قبیلہ اپنے افراد کی تعداد کو زیادہ کرنا چاہتا تھا تا کہ اسے اس جنگ و جدل میں جو تمدن کے ابتدائی مراحل کا خاصہ ہوتا ہے۔ دیگر قبائل پر غلبہ رہے۔ تاہم یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقتصادی لحاظ سے تعداد ازدواج تمدن کی ہر صورت میں مستحسن ہے۔ کیونکہ اس سے آبادی بہت بڑھتی ہے، جو بسا اوقات قوموں کے افلاس کا باعث ہوتی ہے۔

(۳) صرف دولت کی تیسری صورت دستکار کے بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت ہے۔ جس طرح بی بی کا ہونا دستکار کو محنت کی تحریک کرتا ہے۔ اسی طرح بچوں کا پیدا ہونا بھی اس کے لیے ایک مزید محرک ثابت ہوتا ہے۔ بچے کی محبت ایک فطری تقاضا ہے۔ پس باپ کا اپنے بچوں کو پرورش کرنا یا ان کی تعلیم و تربیت پر روپیہ خرچ کرنا کچھ اس خیال سے نہیں ہوتا کہ وہ بڑے ہو کر روپیہ کمائیں گے، یا قوم و ملک کی استحکام کا باعث ہوں گے بلکہ اس کی محبت ایک طبعی جوش ہے۔ جس کو کوئی شے دبا نہیں سکتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض عورتیں بانجھ ہوتی ہیں اور بعض مرد قوت مردمی سے عاری ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کی تعداد نہایت قلیل ہے اس واسطے اس واقعہ کو نظر انداز کر کے اس صریح اصول کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر کسی باپ کے بچوں کی تعداد زیادہ ہوگی اسی قدر اس کے وسائل آمدنی پر اثر پڑے گا۔ اگر کسی شخص کی آمدنی قلیل ہو اور اس کی اولاد بڑھتی جائے، تو صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان کی فارغ البالی وہ نہ رہے گی جو پہلے اسے حاصل تھی۔ موجودہ آمدنی تمام افراد کے گزارے کے لیے کافی نہ ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خاندان کی جسمانی حالت میں فرق آ جائے گا اور وہ پس انداز بھی جو کسی آڑے وقت کے لیے جمع رکھا ہوگا، خرچ ہو جائے گا بلکہ قلت معیشت کی وجہ سے خاندان مذکور میں بعض ایسی بیماریاں پیدا ہو جائیں گی جن کا اثر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا جائے گا۔ جب کسی قوم میں آبادی مناسب حدود سے زائد ہو جاتی ہے تو قدرت خود بخود وبا اور قحط کے تازیانوں سے اس کا علاج کرتی ہے۔ بچے اور بوڑھے اجل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جوانوں کی قوت مردمی میں فرق آ جاتا ہے اور قحط بالعموم آبادی کی افزائش کو روکتا ہے۔ مگر محقق واکر کے نزدیک انسانی قبائل کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ وبا اور قحط کے وسائل کسی قوم کی آبادی کو مستقل طور پر کم نہیں کر سکتے۔ وسیع معنوں میں زندگی کا قیام ایک کلیہ قانون کے تابع ہے۔ جس کو فلسفی قانون بقائے افراد قویہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

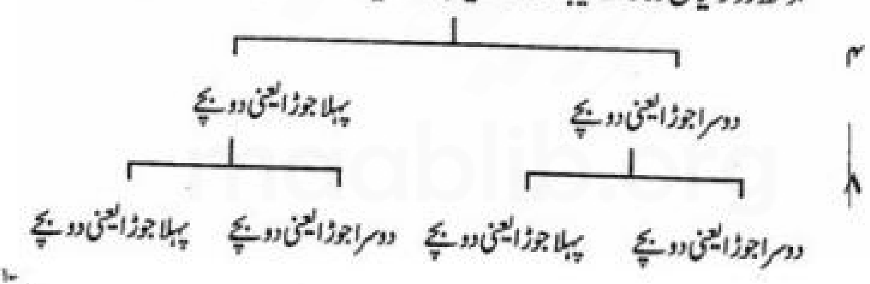
غالباً تمام حکمائے حال اس امر پر متفق ہیں کہ نظام عالم کا ہر حصہ اس قانون کے عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ کیا نباتات کیا حیوانات اور کیا انسان۔ سب کی فنا و بقا کا اصلی راز اسی قانون کا عمل ہے۔ تم جانتے ہو قیام حیات کے وسائل و اسباب ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ پس جب یہ اسباب و وسائل دفعتاً متغیر ہو جائیں اور جانداروں کے کسی خاص طبقے میں وسائل بقا کے تغیر کے ساتھ ہی ان کے مطابق تبدیلی پیدا کر سکنے کی صلاحیت نہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ وہ طبقہ فنا ہو جائے گا اور وہی حیوان محفوظ رہیں گے جو ان وسائل متغیر شدہ میں قائم رہنے کی قابلیت رکھتے ہوں گے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کی آب و ہوا میں دفعتاً اس قسم کی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے جو چارپایوں[2] کے حق میں نہایت مضر ہے۔ اس حالت میں صرف وہی چارپائے زندہ رہ سکیں گے جن کے قویٰ میں تبدیل شدہ آب و ہوا کے متحمل ہو سکنے کی قابلیت ہوگی۔ باقی سب فنا ہو جائیں گے۔ غرض کہ نظام عالم کے ہر حصے میں جانداروں کے درمیان ایک قسم کی مصاف ہستی شروع ہے جس میں قوی افراد فتح پاتے ہیں اور ضعیف و ناتواں افراد صفحہ عالم سے معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر محقق واکر کہتا ہے کہ انسان کی بقا و فنا کی صورت میں یہ قانون کامل طور

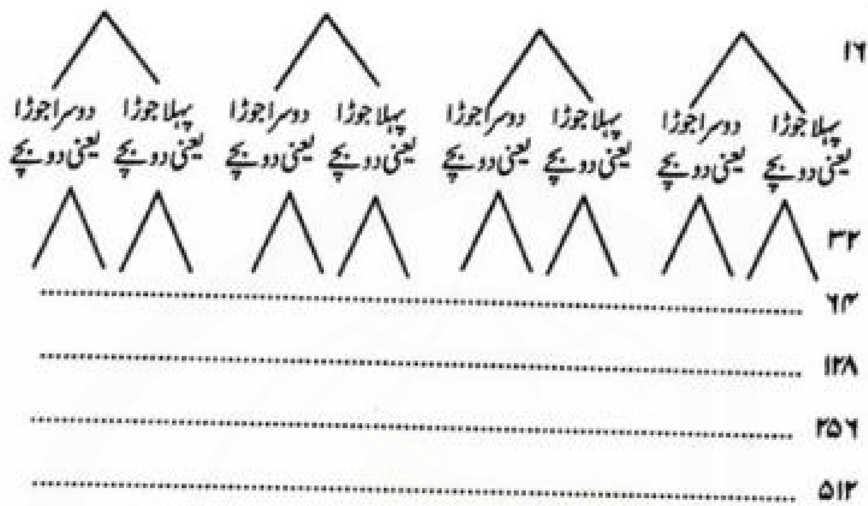
پر عمل نہیں کر سکتا اور وبا و قحط سے جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں، انسانوں کی تعداد میں کوئی مستقل کمی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک انسان اور دیگر حیوانوں میں ایک بڑا فرق ہے جو انسان کو اس قانون کے عمل سے آزاد کرتا ہے۔ حیوانوں اور دیگر جانداروں میں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ مگر انسان کی حالت اس سے مختلف ہے۔ نسبی تعلق جو تمدن انسانی میں خاندان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ایک ایسا زبردست رشتہ ہے جو ایک فرد کو دوسرے افراد سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ جانداروں کے کسی طبقے کا کوئی فرد اگر کسی دکھ درد میں مبتلا ہو جائے تو باقی افراد کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی مگر انسانی خاندان کے کسی فرد کو اگر کوئی مرض لاحق [3] ہو جائے تو باقی افراد نہایت خلوص اور محبت سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کو موت کے پنجے سے چھوڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ مصاف زندگی جو اور حیوانات میں بوجہ اجنبیت و غیریت جاری ہے انسانی قبائل میں بوجہ یگانگت اور تعلقات نسبیہ کے معدوم ہے۔ اس استدلال سے محقق موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انسانی زندگی بوجہ اس یگانگت کے جو تعلقات نسبیہ سے پیدا ہوتی ہے مذکورہ بالا قانون کے عمل سے کلی طور پر آزاد ہے۔ مگر ہماری ذاتی رائے حکیم موصوف کے خلاف ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نسبی تعلقات کی وجہ سے انسان اپنے خاندان کے کمزور اور ناتواں افراد کی حفاظت کرتا ہے، اور مختلف افراد انسانی کے درمیان وہ اجنبیت اور غیریت نہیں ہے جو حیوانوں کو قانون افراد قویہ کے تحت میں لاتی ہے تاہم یہ اجنبیت اور غیریت مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں کے درمیان ضرور موجود ہے۔ اگرچہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان نہیں ہے۔ حکیم موصوف کا خیال اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب تمام انسان یہ محسوس کریں کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور نہ صرف یہ محسوس ہی کریں بلکہ عملی طور پر اس کو کر کے بھی دکھا دیں۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمدن انسانی کے سبب سے اعلیٰ صورت یہی ہے کہ تمام بنی نوع انسان حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ مگر چونکہ نفس الامر میں ایسا نہیں، اس واسطے وہ اجنبیت اور غیریت جو حیوانوں میں موجود ہے اور جو ان کو مذکورہ بالا قانون سے متاثر کرتی ہے، مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ حیوانات میں مصاف زندگی افراد کے درمیان جاری ہے، مگر انسانوں میں یہ لڑائی خاندانوں اور قوموں کے درمیان جاری ہے۔ ہر خاندان اور ہر قوم اس مصاف ہستی میں فتح مند ہونے کی خواہش کرتی ہے اور سب کا یہ قدرتی اور فطری تقاضا ہے کہ حریف کو گرا کر تمام روئے زمین کے خود وارث بن جائیں۔ جس طرح اس

قانون کے اثر سے حیوانوں کی بعض قدیم قسمیں صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی ہیں۔ اسی طرح اس قانون کے عمل سے انسانوں کی قدیم قومیں بھی حرف غلط کی طرح کتاب ہستی سے مٹ گئی ہیں اور اب ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غیر مادی اشیاء مثلاً خیالات و مذاہب کا قیام بھی اسی قانون کے تابع ہے۔ جو خیال یا مذہب انسان کے تمدنی حالات اور اس کی عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی نہ کر سکے گا ضرور ہے کہ وہ انسان کی جدید روحانی ضروریات کو پورا نہ کر سکنے کے باعث معدوم ہو جائے۔ پس ہماری رائے میں مذکورہ بالا قانون انسانی قبائل کی صورت میں بھی اپنا عمل بدستور کر رہا ہے اور قحط و وباء اور آبادی کو کم کرنے کے دیگر قدرتی وسائل کو جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں، اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں تمدن انسانی کی ترقی کے لیے نہایت ضروری شرائط ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ آبادی کا مناسب حدود سے باہر نکل جانا افلاس اور دیگر بدنتائج کا سرچشمہ ہے مگر عملی نتائج پر پہنچنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضرزوری ہے کہ انسانی موت و پیدائش کے درمیان صحیح نسبت کیا ہے۔ یہ ایک ظاہر واقعہ ہے کہ بعض پیدا ہوتے ہیں بعض مرتے ہیں، لیکن مشاہدے اور تجربے کی مدد سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معمولی اموات وغیرہ کو نکال کر شرح پیدائش فی زن و مرد کیا ہے۔ حکیم مالتھس اپنے مضمون موسوم بہ ''آبادی'' میں یہ اصول دریافت کرتا ہے کہ باوجود تجرید اور ضعف مردمی کے' جو بعض صورتوں میں ہوتا ہے، انسان کی شرح پیدائش بحساب اوسط بالعموم چار بچے فی زن و مرد کے حساب سے ہوتی ہے اور اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ آئندہ نسلوں کی قوت تولد و تناسل میں کوئی ضعف نہیں عارض ہوگا تو صاف ظاہر ہے کہ نوع انسان کی آبادی کا شجر مندرجہ ذیل طریق پر شاخ در شاخ ہو کر بارآور ہوتا جائے گا۔

مرد عورت کا ایک جوڑا جو حکیم مالتھس کے نزدیک بالعموم چار بچے پیدا کرتا ہے یعنی بحساب اوسط دو لڑکیاں دو لڑکے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ایک جوڑے سے دو جوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ٢





اس سلسلے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہندسہ اپنے مقدم سے دگنا ہے۔ پس یہ وہ سلسلہ ہے جو اصطلاح ریاضی میں سلسلہ ہندسیہ [4] کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہٰذا نوع انسان کی آبادی بشرطیکہ کوئی اختیاری یا غیر اختیاری اسباب مانع نہ ہوں سلسلہ ہندسیہ کے مطابق برابر بڑھے گی مگر برخلاف اس کے تم پیچھے پڑھ آئے ہو کہ پیداوار زمین یعنی خوراک انسانی قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہے اور اس کی مقدار روز بروز کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ لہٰذا اس واقعہ سے حکیم موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نوع انسان کی آبادی اس قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل اس کے لیے کفایت نہیں کر سکتے۔ ذرا خیال تو کرو اگر نوع انسان کی آبادی بغیر کسی قید کے بڑھ جائے اور انسان اپنی عقل خداداد کی وساطت سے اپنے وسائل زندگی کو زیادہ کرنے کی راہیں نہ سوچے تو بنی آدم کا کیا حشر ہوگا۔ فطرتاً انسان اس قسم کی ہستی ہے کہ اس کے قویٰ نظام قدرت کے ان قویٰ کا مقابلہ کر سکتے ہیں جو اس کے قیام زندگی کے مخالف ہوں۔ قدرت عظیم الشان جنگوں، وباؤں اور قحطوں کی وساطت سے خود بخود آبادی انسان و حیوان کو کم کرتی ہے اور انسان اپنی انجام بینی کی وجہ سے اپنے شہوانی قویٰ پر غلبہ پا سکتا ہے۔ یا افزائش آبادی کے [5] میلان کو اختیاری طور پر بھی روک سکتا ہے۔ حکیم مالتھس کے نزدیک افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا انداز سے زیادہ بڑھ جانا ہے [6]۔ اکثر ممالک کے مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ نوع انسان کی آبادی پچیس سال میں دگنی ہو جانے کا میلان رکھتی ہے۔ جب یہ حال ہو تو جس ملک میں آبادی بلا قید بڑھ رہی ہو وہاں کے لوگوں کو چاہیے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو اختیار کریں جو آبادی کی ترقی کو روک سکتے ہیں۔ انسان کی

قوت تولد و تناسل قدرتاً کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے عمل کو اختیاری یا غیر اختیاری اسباب سے روکا نہ جائے تو اس کا وجود مجموعی طور پر بنی آدم کی بربادی اور تباہی کا باعث ہوگا۔ اجرت کی بحث میں بالعموم یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جب دستکار افزائش آبادی کے بدنتائج کو محسوس کریں گے تو خود بخود ایسے وسائل اختیار کریں گے جن سے آبادی کم ہو۔ مگر تجربہ اس بات کے خلاف ہے چین اور ہندوستان کی موجودہ حالت یہ ظاہر کرتی ہے۔ غریبی اور افلاس کی صورت میں انسان کی قوت تناسل و توالد مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے جس سے آبادی زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتی اور مفلسی کے درد کی شدت کو اور زیادہ جان فرسا بناتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افزائش آبادی کا قدرتی علاج یعنی قحط ان ممالک کو آئے دن ستاتا رہتا ہے۔

حوالہ جات:۔

(1) متن میں "کی بی بی پرورش پاتی ہے" تھا جو نامانوس تھا۔ اسے "رشتہ ازدواج استوار کرتا ہے" سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(2) یہاں اصل نسخے میں "پاؤں" لکھا تھا۔ (مرتب)

(3) یہاں لفظ "لاحق" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ (مرتب)

(4) Geometric Progression (مرتب)

(5) یہاں اصل میں کلمہ "کی" تھا جسے درست کر دیا گیا ہے۔ (مرتب)

(6) (حاشیہ از مصنف) محقق پنسر نے حکیم مالتھس کے اصول آبادی پر ایک نہایت دلچسپ بحث کی ہے، جس میں محقق موصوف نے علم الابدان کی رو سے اس کی کلیت سے انکار کیا ہے البتہ اس قدر تسلیم کیا ہے کہ تمدنی ترقی کے خاص مراحل میں اصول مذکور صحیح ہے۔ کیونکہ یہ بحث علم الاقتصاد کے مبتدی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس واسطے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

باب دوم

جدید ضروریات کا پیدا ہونا

نوع انسان کی آبادی کے متعلق مندرجہ بالا خیالات اول اول حکیم مالتھس نے ظاہر کیے تھے۔ حکیم موصوف نے تجربے، مشاہدے اور تاریخی شہادت سے اس امر کو ثابت کیا کہ:

(۱) ہر ملک میں آبادی اس قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لیے کفایت نہیں کر سکتی۔

(۲) بہت کم قومیں اس افزائش آبادی کو روکنے کے قابل ہوتی ہیں۔

(۳) اگر آبادی اس قدر بڑھ جائے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لیے کفایت نہ کرے تو انسان کی قوت توالد و تناسل بجائے اس کے کہ اس کا عمل کم ہو، مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے اور آبادی کی مقدار کو اور زیادہ کرتی ہے۔

(۴) اگر فراغت سے زندگی گزارنے کا خیال افزائش آبادی کو روکنے سے قاصر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مفلسی اور احتیاج کا خوف بلکہ حقیقی طور پر افلاس کی بیماری میں مبتلا ہو جانا بھی اس کو روک سکے۔

(۵) دنیا کی کوئی قوم ان مصائب کے اندیشے سے آزاد نہیں ہے جو افزائش آبادی سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان ضروری قضایا کو ثابت کرنے کے بعد حکیم مالتھس ان موانع کا ذکر کرتا ہے جو افزائش آبادی کو روکتے ہیں۔ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا دکھ درد کا ایک ایسا خوفناک نظارہ ہوتی کہ کسی دردمند دل کو اس کے دیکھنے کی تاب بھی نہ ہوتی۔ بلکہ ان اسباب کے ہوتے بھی کثیر التعداد بنی آدم غریبی کے روز افزوں دکھ میں مبتلا ہیں۔ جس کی شدت سے مجبور ہو کر ان کو ایسے ایسے

جرائم کا مرتکب ہونا پڑتا ہے، جو انسان کے لیے ذلت و شرم کا باعث ہیں اور اس کی صحیح فطرت کے صاف اور روشن آئینہ کو تیرہ و تار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی اور چوری، قتل، قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزار سے پیدا ہوتے ہیں یک قلم معدوم ہو جائیں گے مگر موجودہ حالات کی رو سے اس کالی بلا کے پنجے سے رہائی پانے کی یہی صورت ہے کہ نوع انسان کی آبادی کم ہو، تا کہ موجودہ سامان معیشت کفایت کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر نئے نئے جزائر دریافت ہوتے جائیں جہاں انسان جا کر آباد ہو سکے اور قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ کامل طور سے کیا جا سکے تو آبادی کی افزائش آسائش انسانی میں خلل انداز نہ ہو سکے گی مگر چونکہ زمین کیت میں محدود ہے اور اس کی پیداوار کچھ نہ کچھ قانون مذکور کے تابع ہے، اس واسطے ضرور ہے کہ افزائش آبادی کے خوفناک نتائج ہمارے آرام و آسائش کے مخل ہوں اور ہمیں اس فراغت سے محروم کر دیں جو بصورت کمی آبادی ہم کو حاصل ہوتی۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم کمی آبادی کے ان اسباب کو عمل میں لائیں جو ہمارے اختیار میں ہیں کہ ان اسباب کا عمل قدرتی اسباب کے عمل سے متحد ہو کر آبادی انسان کو کم کرے اور دنیا مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو کر عیش و آرام کا ایک دلفریب نظارہ پیش کرے۔ حکیم مالتھس کے نزدیک آبادی انسان کی ترقی کو روکنے کے وسائل دو قسم کے ہیں۔

(۱) قدرتی یا غیر اختیاری وسائل مثلاً وبا، قحط اور جنگ وغیرہ۔

(۲) اختیاری۔ مثلاً افراد انسانی کا شادی سے باز رہنا اور اپنے تقاضائے نفسانی اور جذبات فطری کو قابو میں رکھنا اور دیر کے بعد شادی کرنا۔ اگر ان وسائل کو اس طرح اختیار کیا جائے کہ افزائش آبادی پر ان کا پورا اثر ہو، تو قدرتی وسائل یعنی قحطوں اور وباؤں کا تو اثر خود بخود کم ہو جائے گا کیونکہ قحط خوراک کھانے والوں کی کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور وبا مفلسوں کی کمی خوراک اور ان کی جائے رہائش و لباس وغیرہ کے غیر مصفا ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

تمدن کے ابتدائی مراحل میں انسانی ضروریات بہت محدود تھیں۔ مگر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جہاں پہلے صرف خوراک کی خواہش تھی جب یہ پوری ہوئی تو انسان کو مکانوں کی آراستگی اور ان کے نقش و نگار کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ ہر جدید خواہش یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی اور خواہش کو دبائے رکھے اور اس کو پورا کرے لہٰذا

انسان اپنی جدید خواہشوں کے پورا کرنے کی دھن میں اپنی پہلی ضروریات کو محدود کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بالعموم اپنی قوت توالد وتناسل کو بھی کفایت شعاری سے برتنے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بیٹوں کی شادیاں نہیں کرتے جب تک کہ وہ تعلیم سے فارغ نہ ہولیں۔ بیٹے کی تعلیم کو اس کی شادی پر مقدم سمجھتے ہیں بلکہ بسا اوقات اس خیال کا محرک یہی امر ہوتا ہے کہ بیٹے کی شادی ہوگئی تو اولاد پیدا ہونی شروع ہو جائے گی اور بیٹے کو اپنے بچوں کی پرورش کے خیال سے تعلیم خیرباد کہنا پڑے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ شادی کو اسی طرح معرض التوا میں ڈالنا گویا اولاد کی تعداد کو کم کرنا ہے جو بصورت دیگر ایام کتخدائی میں پیدا ہونی ممکن تھی۔ علاوہ بریں تہذیب وتمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مختلف اقسام کے خوردونوش اور طرح طرح کے اسباب تن آسانی کی بھی خواہش ہوتی ہے جو اسے محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس کی قوت تناسل وتوالد پر وہ زبردست اثر کرتی ہے کہ مفلسی کا خوف بھی وہ اثر نہیں کرسکتا کیونکہ امیرانہ ٹھاٹھ سے گزارہ کرنا انسان کی ایک جبلی خواہش ہے اور بسا اوقات یہ خواہش اس کو اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس بعض ممالک میں جہاں کی زمین بالعموم چھوٹے چھوٹے مالکان خودکاشت میں منقسم ہے، زمیندار زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قدر اولاد کی تعداد زیادہ ہوگی اسی قدر ان کی جائیداد زیادہ حصوں میں منقسم ہوگی اور اگر ان کی اولاد کے ہاں بھی اولاد پیدا ہونی شروع ہوگئی تو حصہ زمین کی وہ قلیل مقدار ان کے گزارے کے لیے کسی طرح کافی نہ ہوگی۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ افزائش آبادی کو روکنے کی خواہش زیادہ زور کے ساتھ اسی صورت میں عمل کرتی ہے جبکہ زمین کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ گئی ہو یا بالفاظ دیگر جب انسان کو یہ خیال ہو کہ سامان معیشت کی مقدار کافی طور پر مہیا نہ ہوسکے گی۔ ان اصول کی رو سے تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں سامان معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وباء سے اس کا علاج کرتی ہے مگر ہم کو بھی چاہیے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اپنے قلیل سرمائے کو زیادہ دوراندیشی سے صرف کریں۔ صنعت وحرفت کی طرف توجہ کرکے ملک کی شرح اجرت کو زیادہ کریں اور عاقبت بینی کی راہ سے اپنی قوم کے انجام کی فکر کریں، تاکہ ہمارا ملک مفلسی کے خوفناک نتائج سے محفوظ ہوکر تہذیب وتمدن کے ان اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کرے جن کے ساتھ ہماری حقیقی بہبودی وابستہ ہے۔ ان سطور سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم بنی آدم کو کلی طور پر شادی

وغیرہ کی لذت اٹھانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا ہو اور بی بی کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے اور اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے اور جہاں تک ممکن ہو بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرح پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

حوالہ:-

(1) یہاں اصل میں "مقدار" تھا (مرتب)

باب سوم

صرف دولت

مضمون گزشتہ کی تصریح کی رو سے جدید ضروریات جو پیدا ہوتی ہیں اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کے پورا کرنے کی طرف نسبتاً کم توجہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے سیل رواں کو مسدود کرنے کے لیے کسی زیادہ زبردست روک کا ہونا ضروری ہے۔ تاہم موجودہ حالت میں جدید ضروریات کا پیدا ہوتے جانا کسی اور روک کے نہ ہونے سے اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی محققین کے نزدیک جہاں تک ممکن ہو، سامان معیشت ارزاں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حکیم مالتھس کے مسائل کی رو سے اشیائے خوردنی کی ارزانی افزائش آبادی کے خوفناک نتائج کی طرف سے انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور یہ بے فکری اس کی آئندہ بہبودی کی دشمن ہوتی ہے۔ اگر لوگوں کے روزمرہ استعمال کی اشیاء ارزاں سے ارزاں ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ ایک سال فصل کے نہ ہونے سے ان کی جان پر آ بنے گی کیونکہ ان کا گزارہ پہلے ہی سے ایسی اشیاء پر تھا جو تمام دیگر اشیاء کی نسبت ارزاں تھیں۔ اور اب اس آڑے وقت کے لیے کوئی ارزاں تر شے نہ ہوگی جس پر وہ اپنا گزارہ کر سکیں، لیکن اگر ان کے استعمال کی چیزیں ذرا گراں قیمت ہوں تو قحط سالی میں وہ ارزاں اشیاء پر اپنا گزارہ کر سکیں۔ کشمیر میں چاول سب سے ارزاں شے ہوتی ہے اور لوگ بالعموم اسی شے پر گزارہ کرتے ہیں لیکن جس سال چاول نہیں ہوتے ان کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس آڑے وقت میں ان کو کوئی ایسی شے دستیاب نہیں ہو سکتی جو چاولوں سے زیادہ ارزاں ہو اور جس پر وہ اپنا گزارہ کریں۔ جو سب سے ارزاں شے تھی وہ پہلے ہی ان کے استعمال میں تھی۔ اب اس سے زیادہ ارزاں شے کہاں سے آئے۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی اشیائے خوردنی ارزاں ترین اشیاء نہ ہوں بلکہ کسی قدر گراں قیمت اشیاء ہوں تا کہ اگر ان گراں قیمت اشیاء کا قحط پڑ جائے تو ان ایام

میں وہ سستی اشیاء پر اپنا گزارہ کر سکیں۔ حکیم مالتھس کے مسائل کا یہ نتیجہ صحیح ہے، لیکن اگر عوام اپنا نفع نقصان سمجھ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم رکھنے کی کوشش کریں تو صاف ظاہر ہے کہ سامان معیشت اور اشیائے خوردنی کی ارزانی بجائے اس کے کہ برے نتائج پیدا کرے، ان کے حق میں ایک نعمت ہوگی کیونکہ جو روپیہ کھانے پینے سے بوجہ ارزانی کے بچ رہے گا وہ دیگر آرام و آسائش کے سامانوں پر صرف ہو سکے گا یا بطور سرمایہ کام آ سکے گا۔ صرف دولت کی مختلف صورتوں کا معلوم کرنا خصوصاً اس حالت میں جبکہ لوگ اپنا نفع نقصان سوچ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم کرنے کی کوشش کریں، انتہا درجے کا ضروری ہے۔ کیونکہ صرف دولت کی مختلف صورتیں گویا مختلف اسباب ہیں جو دولت کی آئندہ پیدائش پر اثر کرتے ہیں۔ موجودہ محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ مضبوط ہوتا ہے۔ افراد قوم کی اخلاقی اور جسمانی حالت ترقی کرتی ہے اور بحیثیت مجموعی ملک کی سیاسی اور اقتصادی نظام کے تمام اجزا ہم آہنگ ہو کر قوم کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف دولت کی کون کون سی صورتیں تمدنی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر برا اثر کرتی ہیں اور پیدائش دولت کے پیچیدہ اسباب کو پورا عمل کرنے سے روکتی ہیں۔ انگلستان میں اس وقت دو ارب ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف شراب پر خرچ ہوتا ہے اگر یہی روپیہ کسی اور مفید صورت میں صرف ہوتا تو ملک کی اقتصادی حالت پر نہایت اچھا اثر کرتا۔ موجودہ زمانے میں ایک ایسے فلسفی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو مندرجہ بالا امور کی پوری تفتیش اور تحقیق کر کے علم الاقتصاد کے اس حصہ کو پورا کرے۔

ضمیمہ

ان معاشی اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں

A

Agent	عامل۔کارندہ
Alternative Standard	متبادل معیار
Arbitration	ثالثی، پنچایت
Assets	اثاثہ

B

Balance of Trade	توازن تجارت
Bank	بنک
Banking	بنکاری
Barter	جنسی تبادلہ
Bill of Exchange	ہنڈی
Broker	دلال
Brokerage	دلالی
Bullion	فلز
Business Organisation	کاروباری تنظیم

C

Capital	اصل سرمایہ
Capital Expenditure	مصارف اصل، مصارف سرمایہ
Capitalism	اصل دارانہ نظام
Circulating Capital	سرمایہ دائر

Circulating Medium	گشتی زر، چالوزر
Clearing House	تبادلہ گاہ
Coin	سکہ
Coinage	سکہ زنی
Communism	اشتمالیت (اشتراکیت)
Competition	تجارتی رقابت، مقابلہ
Concentration	ارتکاز
Consumer	صارف
Consumption	دولت کا صرف یا استعمال
Convertible	بدل پذیر
Convertible Paper Money	زر کاغذی متبدل
Cooperative Principle	اصول امداد باہمی
Cost	لاگت
Cost of Coinage	حق الضرب
Cost of Production	مصارف پیدائش
Cost of Transport	مصارف بار برداری
Cost Price	لاگتی قیمت
Cottage Industries	گھریلو صنعت
Credit	ساکھ، اعتبار، قرض
Credit Instrument	دستاویز اعتبار
Current Price	قیمت متعارف

D

Debt	قرضہ
Distribution	دولت کی تقسیم
Debt , Public	سرکاری قرضہ
Demand	طلب
Demand Price	قیمت طلب
Differential Comparative Cost	اختلاف مصارف متقابلہ

Discount	مٹی کاٹا
Disequilibrium	عدم توازن
Divisibility	تقسیم پذیری
Division of Labour	انقسام محنت
Duty	محصول

E

Economic Rent	معاشی لگان
Efficiency	کارکردگی
Elasticity	لوچ، لچک
Elasticity of Demand	طلب کا لوچ (لچک پذیری طلب)
Elasticity of Supply	رسد کا لوچ (لچک پذیری رسد)
Employer	آجر
Equilibrium Price	قیمت صحیحہ
Exchange	دولت کا تبادلہ
Exchange Goods	اشیاء قابل تبادلہ
Exploitation	استحصال
Export Import Duty	محصول درآمد و برآمد

F

Face Value	عرفی قیمت
Factors of Production	عاملین پیداوار
Fertility	زرخیزی
Finance	مالیات
Fiscal	محصولی
Fixed capital	سرمایہ قائم
Foreign Exchange	تبادلہ خارجہ
Foreign Trade	خارجی تجارت
Free Coinage	آزاد سکہ سازی
Free Competition	آزاد مسابقت

Free Goods	اشیاءآزاد
Free Trade	آزادتجارت
Fund	ذخیرہ،صندوق

G

Geometric Progression	سلسلہ ہندسیہ
Gold Standard	معیارطلاء
Gross Interest	سودکاذب
Gross Profit	خام منافع
Gross Revenue	خام آمدنی

I

Inperfect Competition	مقابلہ ناکامل
Import	درآمد
Income Tax	محصول آمدنی
Inconvertible Paper Money	زرکاغذی غیرمتبدل
Industrialism	صنعتیت
Inflation	افراط زر
Interest	سود
International Trade	بین الاقوامی تجارت
Intrinsic Value	قیمت ضربی
Issue	اجرا

L

Labour	محنت
Labourer	محنتی
Land Revenue	مال گزاری
Law of Diminishing Utility	قانون تقلیل افادہ
Law of Diminishing Returns	قانون تقلیل اصل
Legal Tender	نقدقانونی
Liability	ذمہ داری،دین داری

Luxuries	تعیشات

M

Margin	حد
Margin of Cultivation	کنارہ زراعت
Marginal	حدی، مختتم
Marginal Utility	افادت انتہائی
Market	بازار
Measure of Value	پیمانہ قدر
Mercantilism	نظام تجارت
Metallic Value	دھاتی قدر۔ فلزاتی قدر
Mineral Resources	معدنی ذرائع، معدنی وسائل
Mobility	نقل پذیری
Money	زر
Monopoly	اجارہ
Mortgage	رہن
Mortgager	مرتہن
Mortgagee	راہن

N

Nationalization	قومی ملکیت بنانا، قومیانا
National Wealth	قومی دولت
Necessaries	ضروریات
Net Interest	خالص سود
Net Revenue	خالص آمدنی
Nominal Value	ظاہری قدر
Nominal Wages	ظاہری اجرت

O

Optimum Point	نقطہ تقلیل
Output	مقدار (کام یا پیداوار کی)

Over- Population	کثرت آبادی

P

Paper Money	زرکاغذی
Parity of Exchange	شرح مبدل
Peasant Proprietor	مالک کاشتکار،خودکاشت زمیندار،فلاح
Personal Wealth	ذاتی دولت
Planning Economic	معاشی منصوبہ بندی
Positive Checks	اثباتی روک
Preventive Checks	انسدادی روک
Price	قیمت
Productive	دولت آفرین
Productivity	قابلیت پیداوار
Production	دولت کی پیدائش
Profit	منافع
Property	جائیداد
Protection (of trade) Protective Trade	حفاظت،تجارت،یا تامین تجارت
Public Debt	سرکاری قرضہ
Public Finance	مالیات
Public Revenue	محصول آمدنی
Raw Material	مصالح

R

Real Wages	حقیقی اجرت
Rent	لگان
Retail	خردہ فروشی
Revenue	آمدنی،محاصل

S

Saving	بچت
Scarcity	دقت حصول

Skill	مہارت
Specialisation	تخصیص
Standard of Deferred Payment	ادائیگی غیر موجل کا معیار
Standard of Value	معیار قدر
Stocks	ذخیرے
Supply	رسد
Surplus	فاضل

T

Tax	محصول
Taxation	محصول بندی
Technology	علم صنعت
Token Money	زر علامتی
Trade Cycle	تجارتی چکر

U

Usury	ربا
Utilities	مفیدات
Utility	افادت
Utility, Form	قدر مختص بالہیئہ
Utility, Place	قدر مختص بالمکان
Utility, Time	قدر مختص بالزمان

V

Value	قدر
Velocity of Circulation	سرعت انتقال

W

Wage	اجرت
Want	احتیاج
Wealth	دولت
Working Capital	کاروباری سرمایہ

مزید کتابیں

زندہ رود	ڈاکٹر جاوید اقبال
اپنا گریباں چاک (خودنوشت سوانح حیات)	ڈاکٹر جاوید اقبال
اقبال فراموشی	پروفیسر فتح محمد ملک
اقبال کا فکری نظام اور تصور پاکستان	پروفیسر فتح محمد ملک
اقبال افغان اور افغانستان (اردو، فارسی، پشتو اور انگریزی)	ترتیب و تالیف: محمد اکرام چغتائی
کلیات اقبال	علامہ محمد اقبال
بانگ درا (اعلیٰ ایڈیشن)	علامہ محمد اقبال
شکوہ جواب شکوہ	علامہ محمد اقبال
علم الاقتصاد	علامہ محمد اقبال
اقبال شناسی اور آغا صادق	ترتیب: ڈاکٹر نوید حسن
اقبال ___ نئی تفہیم	ڈاکٹر صدیق جاوید
اقبال: شخصیت، افکار و تصورات: مطالعہ کا نیا تناظر	ڈاکٹر سلیم اختر
علامہ اقبال - حیات، فکر و فن	ڈاکٹر سلیم اختر
اقبال اور ہمارے فکری رویے	ڈاکٹر سلیم اختر
فکرِ اقبال کا تعارف	ڈاکٹر سلیم اختر
فکر اسلامی کی تشکیل نو	پروفیسر محمد عثمان
اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی
ولی سے اقبال تک	ڈاکٹر سید عبداللہ
اعجاز اقبال	ڈاکٹر سید عبداللہ
اقبال کی طویل نظمیں (فکری و فنی مطالعہ)	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی

شرح اقبال

اُردو

۱) بانگِ درا
۲) بالِ جبریل
۳) ضربِ کلیم
۴) ارمغانِ حجاز (فارسی - اُردو)
۵) اسرار و رموز
۶) پیامِ مشرق
۷) جاوید نامہ
۸) زبورِ عجم
۹) پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق / مسافر

The Reconstruction of Religious Thought in Islam	Allama Muhammad Iqbal
The Development of Metaphysics in Persia	Allama Muhammad Iqbal
Iqbal and Tagore: New Avenues for their Comparative study	M. Ikram Chaghatai
Iqbal: New Dimensions	Ed. by M. Ikram Chaghatai
Iqbal Afghan and Afghanistan (English, Urdu, Persian, Pashto)	" "
Iqbal: The Spiritual Father of Pakistan	Rashida Malik
Iqbal: The Great Poet of Islam	Sh. Abdul Qadir
A Voice from the East (The Poetry of Iqbal)	Zulfiqar Ali Khan

Rs. 600.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-1602-8
ISBN-13: 978-969-35-1602-9
9789693516029